

میر واہ کی راتیں .. رفاقت حیات

مارچ 9, 2016 فکشن، میر واہ کی راتیں، رفاقت حیات

آج کی رات اس کی بےکار زندگی کی گزشتہ تمام راتوں سے بےحد مختلف تھی، شاید اسی لیے نیند اس کی آنکھوں سے پھسل کر رات کے گھپ اندھیرے میں کہیں گم ہو گئی تھی، مگر وہ اسے تلاش کرنے کی بےسود کوشش کر رہا تھا کیونکہ وہ گہری نیند سو کر خود کو اگلی شب کے رت جگے کے لیے تیار کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دماغ میں چلنے والے خیالات کے تیز جھکڑوں اور ان سے اٹھنے والے سرکش بگولوں کی وجہ سے آج رات اس کے لیے پلک جھپکنا دشوار تھا اور آنکھیں موند کر سونا بالکل ناممکن۔ وہ محرابوں والے برآمدے میں چھت کی سیڑھیوں کے قریب چارپائی پر رضائی اوڑھے لیٹا ہوا رات گزارنے کی تدبیر ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا اور اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے تکیے کے نیچے سے ایک بوسیدہ اور مڑے تڑے صفحات والا رسالہ نکالا اور کئی مرتبہ کی پڑھی ہوئی کہانیوں پر نظرڈالنے لگا۔ اسے ’مومل رانا‘ کی کہانی بےحد پسند تھی مگر آج اپنی پسندیدہ کہانی پڑھتے ہوے نجانے کیوں اس کے سر میں درد ہونے لگا۔ باریک لفظوں کی سطریں جو کاغذ کی سطح پر قطار باندھے کھڑی تھیں، دھیرے دھیرے بکھرنے لگیں۔ باریک لفظ موقلم بن کر کاغذ کی سطح پر ایک خاکہ بنانے لگے۔ خاکہ مبہم اور غیرواضح تھا، مگر غور کرنے پرکسی عورت کی پشت معلوم ہوتا تھا۔ عورت کا خیال آتے ہی وہ خاکے پر اور زیادہ غور کرنے لگا، مگر یہ کیا؟ اچانک تمام لفظ کاغذ کی سطح سے یکسر غائب ہو گئے، اور ان کے ساتھ ہی لفظوں سے بنا وہ مبہم سا خاکہ بھی غائب ہو گیا۔ وہ حیرت سے رسالے کے اوراق پلٹنے لگا۔ رسالے کے تمام اوراق لفظوں سے یکسر خالی ہو چکے تھے۔ کسی بھی صفحے پر نہ تو کہانی کا عنوان لکھا نظر آ رہا تھا اور نہ ہی کہانی کی عبارت۔ سارے کے سارے کاغذ کورے نظر آ رہے تھے۔ اسے ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا کہ وہ اس وقت مومل کے کاک محل میں موجود ہے۔ اس نے بلاتردد رسالے کو اس کی جگہ واپس رکھ دیا اور تکیے پر اپنا سر رکھ کر وہ سیدھا لیٹ گیا اور رضائی کو اپنے آدھے جسم پر اوڑھ لیا۔ اس نے کئی مرتبہ آنکھیں زور سے میچ کر نیند کے خمار کو اپنے ذہن پر طاری کرنے کی کوشش کی مگر ہر مرتبہ اس کے ذہن نے اس دھوکے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یکے بعد دیگرے کروٹیں لینے کے بعد وہ ایک بار پھر سیدھا ہو کرلیٹ گیا۔

اس کی آنکھیں خودبخود محرابوں والے برآمدے کی اونچی چھت پر بھٹکنے لگیں۔ بےضرورت اور بےسبب وہ چھت کی کڑیاں گننے لگا۔ اس نے پہلے دائیں سے بائیں اور پھر بائیں سے دائیں چھت کی کڑیوں کو شمار کیا مگر دونوں مرتبہ ان کی تعداد اکیس ہی نکلی۔ اکیس بظاہر تو گنتی کا سیدھا سادہ عدد ہے مگر اس کا خودسری پر آمادہ ذہن اس عدد سے کوئی خاص مطلب برآمد کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے اکیس کے دو اور ایک کو آپس میں جمع کر دیا اور اس کے حاصل جمع تین پر خوامخواہ غور کرنے لگا۔ یہ سادہ سا عدد اس کے ذہن کو اقلیدس کے مسئلے کی طرح پیچیدہ معلوم ہو رہا تھا۔ دو کا عدد اس پیچیدگی کا حامل نہیں تھا جو پیچیدگی تین کے عدد میں پنہاں محسوس ہو رہی تھی۔ تین یعنی تیسرا کئی شکوک کو جنم دیتا تھا، شاید اسی مشکوک تیسرے کو مومل کے پہلو میں سویا ہوا دیکھ کر رانا کاک محل چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلا گیا تھا۔ وہ اس بات سے بےخبر تھا کہ مومل نے محض اس کے حاسدانہ جذبے کو انگیخت کرنے اور اس سے تفریح لینے کے لیے اپنی چھوٹی بہن سومل کو رانا کا روپ دیا ہوا تھا۔

مگر نذیر رانا مہندر سنگھ سوڈو نہیں تھا۔ وہ بہت دیر سے محرابوں والے برآمدے سے ملحقہ کمرے سے سنائی دینے والی عورت اور مرد کی دھیمی دھیمی اور مبہم سرگوشیاں سن رہا تھا۔ ان سرگوشیوں کے مختلف اتارچڑھاؤ محسوس کرتے ہوے، جن میں بعض اوقات دبی دبی ہنسی اورگھٹا گھٹا سا قہقہہ بھی شامل ہوتا تھا، وہ بھی حاسدانہ مخاصمت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ان کی سرگوشیوں میں چھپی باتوں کو سمجھنے کی بہت کوشش کی۔ وہ جتنی زیادہ کوشش کرتا اتنا ہی زیادہ رقابت کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا۔ حسد اور رقابت کے جذبات نے اس کے رگ و پے میں عجیب سنسنی اور گرمی سی پیدا کر دی۔ وہ رضائی اتارنے پر مجبور ہو گیا۔ کچھ دیر بعد کمرے سے سرگوشیاں سنائی دینی بند ہو گئیں، شاید وہ دونوں اب سو گئے تھے۔

وہ کھاٹ سے اُتر کر صحن کے ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں چلنے لگا۔ اس کے رگ وپے میں دوڑنے والی گرمی دھیرے دھیرے ختم ہو گئی مگر ایک عجیب سی سنسنی اب بھی باقی تھی۔ اس کی زندگی میں ایسی مضطرب اور اذیت بھری رات نہیں آئی تھی۔ ا سے توقع تھی کہ اس کی زندگی کا سب سے خوبصورت اور لذیذ واقعہ صرف ایک رات کی مسافت پر تھا مگر اس کے درمیان حائل آج کی رات کسی طور کٹنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ اس نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوے آسمان پر ٹمٹماتے ہوے ستاروں کی ماند پڑتی روشنی کو دیکھا۔ آج آسمان پر چاند کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ آئندہ شب پیش آنے والی مہم جوئی کے متعلق آسمان سے مدد کی درخواست کرے۔ مگر اگلے ہی لمحے اسے خیال آیا کہ آئندہ شب وہ کوئی کارِخیر انجام دینے تھوڑا ہی جا رہا ہے کہ وہ آسمان سے مدد کی درخواست کرے۔ ایسی درخواست کرنے کی صورت میں آئندہ شب اسے کسی افتاد کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا تھا۔ اس نے فوراً یہ خیال ترک کر دیا۔

صحن میں ٹہلتے ہوے اسے کسی کونے سے دھیمی سی شونکار سنائی دی۔ اسے فوراً یاد آیا کہ رات کی خنکی میں سانپ اور بچھو اپنے اپنے بلوں سے باہر نکل آتے ہیں۔ وہ فوراً کھاٹ پر جا لیٹا اور ایک بار پھر نیند کی پری کو گرفت میں لینے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی کوشش کے دوران اسے نیند آ گئی، نیند کی پری اس پر مہربان ہو گئی۔

وہ رضائی میں سمٹا ہوا سو رہا تھاکہ ایک نسوانی آواز نے اسے پکارا۔ اس کا جواب نہ پا کر وہ اس کے قریب آئی۔ اس کے چہرے سے رضائی ہٹا کر چند ثانیے اس کے سوئے ہوے چہرے کو دیکھتی رہی، پھر اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے نرم ہاتھ سے اس نے اس کی پیشانی کو چھوا تو وہ فوراً جاگ گیا۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیرحیرت سے چاچی خیرالنسا کو تکنے لگا۔

”نذیر، اب اُٹھ جا۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔

وہ بستر سے اُٹھا نہیں اور اس نے اپنے ہونٹوں سے کچھ کہا بھی نہیں۔ وہ حیران تھا کہ آج صبح چاچی خیرالنسا اسے پہلے سے زیادہ حسین اور پرکشش کیوں محسوس ہو رہی تھی۔ شاید اپنے لمس کی وجہ سے وہ اس کے لیے یک دم پہلے سے زیادہ حسین ہو گئی تھی۔ وہ عجیب ندامت میں لپٹی ہوئی اس کی کھاٹ کے پاس کھڑی تھی۔ اس کا لباس شکن آلود تھا اور بال بکھرے ہوے تھے۔ اس کے چہرے پر نیند کی سوگواری تھی۔ یکایک اس نے اپنے سینے سے چادر ہٹائی اور اپنے دونوں ہاتھوں سے پھیلا کراسے دوبارہ اپنے جسم پر تانا اورغسل خانے کی طرف چلی گئی۔

نذیر اس کے جانے کے بعد اس کی خوشبو کو محسوس کرتا رہا۔ اس کے ہاتھ کا نرم گرم لمس اس کی پیشانی میں جذب ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے غسل خانے کے فرش پر پانی گرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ کھاٹ پر لیٹے لیٹے پانی گرنے کی آواز سنتے ہوے کسمساتا رہا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اسی لمحے بھاگ کر غسل خانے میں جا گھسے اور ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر چاچی کو بےلباس دیکھ لے — وہ جسے لباس میں کئی مرتبہ عریاں دیکھ چکا تھا۔ اس نے اپنے تصور میں ہینڈپمپ کے پانی کی دھار کے نیچے سمٹے نسوانی جسم کو دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا۔ اس نے اپنے جسم سے رضائی ہٹا دی اور صحن کے ساتھ واقع خالی احاطے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہاں صبح کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

جب وہ ٹھٹھرتی ہوئی غسل خانے سے باہر آئی تو نذیر اسے ٹھیک طرح دیکھ نہیں سکا۔ اس نے اس کے بدن سے اٹھتی صابن کی مہک اور اس کے جسم کے گیلےپن کو محسوس کیا۔ وہ اپنے سامنے کھڑی بھرپور اور پرکشش عورت کو، اس کی نظروں کے سامنے، غور سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ اس کی فطری کم ہمتی تھی یا بزدلی۔ وہ ایسے موقعے کی تلاش میں تھا جب وہ اس کی جانب سے توجہ ہٹا کر کسی اور طرف دیکھنے لگے، مگر وہ اسی کی طرف دیکھتی ہوئی تولیے سے اپنے بال سکھانے لگی۔

”اندر نلکے کا پانی کوسا کوسا اے۔ اُٹھ، تُو بھی نہا لے۔“ وہ نذیر کو مکمل طور پر مایوس کرتی کمرے میں چلی گئی۔

نذیر نے جماہی لی اور چپلیں پہن کر غسل خانے کی طرف چلا گیا۔ اندر آ کر وہ گیلے فرش اور بھیگی ہوئی دیواروں کو دیکھنے لگا۔ معاً اس کی نظر کیل میں اٹکے ہوے بلاؤز کی طرف اٹھی تو اس کی رگوں میں سنسنی پھیل گئی۔ اس نے

پردہ ہٹا کر باہر دیکھا، کوئی اس طرف تو نہیں آ رہا۔ اطمینان کر لینے کے بعد اس نے کیل سے بلاؤزاُتار لیا اور اسے آنکھوں کے قریب لا کر دیکھنے لگا۔ وہ گلابی ریشمی کپڑے سے بنا ہوا اور ہاتھ سے سِلا ہوا بلاؤز تھا۔ وہ انگلیوں سے اسے ٹٹولنے لگا۔ بلاؤز کو دیکھنا اور چھونا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ اس کے کناروں پر ہلکی سی گرد جمی ہوئی تھی اور کہیں کہیں اکادکا بال بھی اٹکے ہوے تھے۔ دھیرے دھیرے وہ بلاؤز کو اپنی ناک کے قریب لے گیا اور اسے سونگھنے لگا۔ اسے سونگھتے ہوے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ وہ خود کو کسی عورت کے قرب میں محسوس کرنے لگا۔ وصل کی سرشاری جیسی سرشاری اس پر طاری ہونے لگی۔ اس نے بلاؤز کو ناک کے قریب سے ہٹایا اور دوبارہ وہیں کیل پر لٹکا دیا۔

اس نے کچھ دیر ہینڈپمپ چلا یا۔ جب اس میں سے کوسا پانی نکلنے لگا تو اس نے اپنی قمیض اُتار کر اسی کیل پر لٹکا دی۔ اب وہ اپنے سینے اور اپنے بازوؤں کا معائنہ کرنے لگا۔ اسے ان کی سپیدی اور نرمی اچھی لگی۔ اپنی چھاتی پر ابھرے نوخیز بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوے اس کا ذہن ایک بار پھر چاچی خیرالنسا کے لذیذ تصورمیں گم ہو گیا۔ اسے اپنی کم مایگی اور ناتجربہ کاری کا احساس ہونے لگا۔

جب وہ اپنی شلوار اتارنے لگا، وہاں اسے ایک گدلاسا دھبا دکھائی دیا۔ دھبا دیکھتے ہی وہ اسے مسلتے ہوے اپنے دانت کچکچانے لگا۔

”آج یہ نہیں ہونا چاہیے تھا،“ وہ جھلاہٹ میں بڑبڑایا۔

وہ خود کو کمزور و ناتواں محسوس کرنے لگا، جیسے وہ دھبا کسی جان لیوا مرض کی علامت ہو۔ اسے لگا کہ اس کے بدن سے تمام قوت نکل گئی ہے اور اس کی تمام خواہشیں یکایک مرجھا گئی ہیں۔ آج کی رات، وہ شدید بےتابی سے جس کا انتظار کرتا رہا تھا، اب زیادہ دور نہیں تھی۔ اس نے سوچا کہ ذرا دیر کے لیے اس کی آنکھ کیا لگی، نیند کی پری اس کی جان ہی نکال کر لے گئی۔ شاید اس نے کوئی خواب دیکھا تھا اور خواب میں کوئی عورت — مگر وہ عورت کون تھی؟ کیسی تھی؟ وہ اپنے ذہن کو ٹٹولتا رہا مگر اسے مطلق یاد نہیں آ سکا۔ خواب میں آنے والی عورت نہ تو چاچی خیرالنسا تھی اور نہ ہی رانا مہندر سنگھ سوڈو کی چہیتی مومل۔ سوچتے سوچتے وہ زچ ہو گیا۔ اِس نے افسردگی سے اپنی ٹانگوں کی طرف دیکھا تو وہ اسے سوکھی سڑی معلوم ہوئیں۔

بہ مشکل وہ اپنے ذہن سے تمام خیالات جھٹک کر ہینڈپمپ چلا کر غسل کرنے لگا۔ غسل کے بعد وہ اپنی شلوار پر چپکے ہوے چپچپے مادے کوصابن سے رگڑ رگڑ کر دھونے لگا۔ کچھ ہی دیر میں اس نے دھبے کو شلوار سے مٹا ڈالا کیونکہ اسے نماز بھی تو پڑھنی تھی۔ نذیر نادانستہ سرزد ہونے والے عمل پر نادم تھا اس لیے وہ غسل خانے سے نکل کر بھی خود کو ملامت کرتا رہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ نئے دن کا آغاز کسی بدشگونی سے ہو، مگر اس کی خواہش کے برخلاف بد شگونی رونما ہو چکی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ آج رات اس کے ساتھ کیا پیش آنے والا تھا۔ اس کی توقع کی تکمیل ہونی تھی یا اسے ملیامیٹ ہونا تھا۔

جب تک اس کی شلوار سوکھ نہیں گئی وہ بار بار اپنی شلوار کو دیکھتا رہا۔ اطمینان کر لینے کے بعد اس نے تکیے کے نیچے پڑا ہوا رومال اُٹھایا اور اسے اپنے سر پر باندھ لیا۔

اسے چاچی صحن اور برآمدے میں نظر نہیں آئی تو وہ دروازے سے کمرے کے نیم تاریک ماحول میں جھانکنے لگا۔ وہاں چاچی اسے نماز پڑھتی نظر آئی، جبکہ غفور چاچا ابھی تک گہری نیند سویا ہوا تھا۔ وہ مڑ کر پچھلے دروازے کی طرف چلا گیا جو پیچھے والی گلی کی طرف نکلتا تھا۔

گلی میں صبح کی دھندلی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مکانوں کے دروازوں اور کھمبوں پر جلتے بجلی کے بلب صبح کی پھیلتی روشنی کے سبب اپنی چمک کھوتے جا رہے تھے۔ وہ گلی کے پختہ اینٹوں سے بنے فرش پر چلتا رہا۔ اچٹتی ہوئی نیند کے دوران دکھائی دینے والا خواب تو اسے بھول چکا تھا، مگر اس خواب کے دوران ملنے والی لذت کی ہلکی سی رمق اس کے ذہن کے کسی خفیہ گوشے میں اب بھی موجود تھی۔ وہ اس کے بارے میں سوچتا سوچتا رک گیا۔ ایک بار پھر وہ اپنی شلوار کو ٹٹول کر دوبارہ چل پڑا۔

اب روشنی خاصی پھیل چکی تھی۔ ابھی وہ مسجد سے کافی فاصلے پر تھا کہ اسے نمازی مسجد سے باہر نکلتے دکھائی دیے۔ فجر کی نماز پڑھی جا چکی تھی۔ وہ قصبے کی دو چار گلیاں گھوم کر واپس آ گیا تاکہ چاچی کے پوچھنے پر اُسے بتا سکے کہ وہ نماز پڑھ کر آیا ہے۔

وہ گھر میں داخل ہوا تو اسے باورچی خانے سے آنکھوں میں چبھنے والا گاڑھا دھواں سارے گھر میں پھیلا ہوا دکھائی دیا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا باورچی خانے میں چلا گیا۔ یہاں صرف دھواں ہی دھواں بھرا نظر آتا تھا۔ نذیر کی آنکھوں سے فوراً پانی بہنے لگا۔ بہت غور کرنے کے بعد اسے بہ مشکل چولھے کی آگ نظر آ سکی۔ وہ اپنے پیروں سے زمین ٹٹول کر چلتا ہوا چولھے کے پاس پہنچا تو اسے چاچی کی ناک اور آنکھوں سے بہتا ہوا پانی دکھائی دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ ٹال والے نے ایک مرتبہ پھر گیلی لکڑیاں بھیج دیں۔ اس نے دھونکنی اٹھائی اور اس کی مدد سے کچھ دیر تک پھونکیں مارتا رہا۔ اس عمل سے چولھے میں آگ بھڑک اٹھی۔ دھونکنی ایک طرف رکھ کر وہ گیلی لکڑیوں کو چولھے سے نکالنے لگا، جس سے آہستہ آہستہ باورچی خانے میں بھرا ہوا دھواں باہر نکلنے لگا اور دھویں کی چبھن بھی دھیرے دھیرے ختم ہونے لگی۔ اس نے چاچی خیرالنسا کی طرف دیکھا۔ وہ ڈوپٹے سے اپنی ناک اور آنکھیں پونچھ رہی تھی اور اس کا سفید چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ چولھے میں جلتی آگ اس کے چہرے کی تابانی میں اضافہ کر رہی تھی۔ وہ کھنکار کر گلا صاف کرتی ہوئی کہنے لگی، ”تیرے چاچے کی طبیعت آج خراب ہے۔“

اس نے تجسس سے پوچھا، ”کیا ہوا؟“

”میرا خیال ہے اسے سردی لگ گئی ہے۔“ وہ اپنے ڈوپٹے کی مدد سے چائے کی دیگچی اُتارتے ہوئے بولی۔

”چاچے کو سردی کیسے لگ گئی؟ وہ تو کل کہیں باہر گیا ہی نہیں تھا۔“ وہ اپنے سوالوں میں چھپی حیرت کو چاچی سے پنہاں نہ رکھ سکا۔ اس کی حیرانی کو بھانپ کر چاچی نے جواب دینے کے بجائے اپنا سر جھکا لیا۔

اس سے پہلے کہ وہ اپنی کرید میں مزید کچھ پوچھتا، اسے چاچے کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ کھانسی کی آواز سنتے ہی وہ نذیر کی موجودگی سے غافل ہو گئی اور اپنے لباس کی شکنیں درست کرنے لگی۔ اس کے بعد اس نے اپنی چادر کو سینے پر پھیلا لیا۔ کچھ دیر بعد کھانستا ہوا چاچا غفور سر سے پاؤں تک کھیس میں لپٹا ہوا باورچی خانے کی کوٹھڑی میں داخل ہوا۔

اسے دیکھ کرنذیر فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی چوکی چاچے کو پیش کر دی اور خود زمین پر آلتی پالتی مار کربیٹھ گیا۔

”جیتے رہو،“ چاچا نقاہت سے بولا۔ اس نے اپنے سر سے کھیس اُتار لیا۔ شیو نہ کرنے کی وجہ سے اس کے چہرے پر سفید داڑھی نکل آئی تھی۔ گالوں کی ہڈیاں نمایاں تھیں اور آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ وہ ہانپ رہا تھا، جیسے اپنی سانسوں پر اسے کوئی اختیارنہیں تھا۔ چاچی نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔

” کمرے سے کیوں نکل آئے؟ میں چائے وہیں لے آتی،“ اس نے منھ بسورتے ہوئے شکایت کی۔

”میں نے سوچا آگ کے پاس بیٹھوں گا تو سردی کم لگے گی، اس لیے یہاں آ گیا،“ وہ لفظوں پر زور دیتے ہوئے بہ دقت بولا اور دھیرے سے مسکرا کر اپنی بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔

چاچی نے اس کی مسکراہٹ نظرانداز کرتے ہوئے نظریں جھکا لیں اور دیگچی اُلٹا کر تام چینی کے پیالوں میں چائے انڈیلنے لگی۔

”پُتر نذیر! آج میں دکان نہیں جاؤں گا۔ مجھے سردی لگ رہی ہے اور بدن میں کپکپاہٹ سی بھی ہے۔ تُو سویرے ہی دکان پر چلا جا اور دکان کھول لے۔ حاجی اللہ بخش کو بھریاروڈ جانا ہے۔ میں اس کے جوڑے کل ہی سی کر آیا تھا۔ تو اس سے پیسے لے لینا۔ اور ہاں، کل ماسٹر طفیل کے بیٹے کی شادی ہے۔ وہ بھی شام کو اپنے کپڑے لینے آئے گا۔ کوئی اگر میرا پوچھے تو کہنا کہ بخار چڑھا ہے۔ کل ضرور آؤں گا۔“ باتیں کرتے ہوئے چاچے کی سانس پھول گئی اور وہ مزید بول نہیں سکا۔

نذیر چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے بےدھیانی سے سنتا، ہوں ہاں کرتا رہا۔

چاچی خیرالنسا پریشان لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں چولھے میں راکھ ہوتے اور بجھتے ہوئے انگاروں پر جمی تھیں۔

کچھ دیر بعد چاچا غفور نذیر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوے بولا، ”سلائی مشین پر تیرا ہاتھ صاف ہو گیا ہے۔ اب میری دکان تیرے حوالے۔“ نذیر نے اثبات میں سر ہلایا۔ یہ بات سن کر چاچی زیرلب مسکرائی۔ اس نے تیکھی نظروں سے بھتیجے کو دیکھا اور اپنا نچلا ہونٹ کاٹنے لگی۔

چاچے غفور کی بات سن کر وہ نجانے کیوں ندامت محسوس کر رہا تھا۔ اپنے کندھے پر اس کا کمزور و ناتواں ہاتھ اسے بھاری بھرکم محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خود کو چاچے کے اس اعتماد کا مستحق نہیں سمجھتا تھا۔ اپنے ناکردہ گناہوں کا بوجھ اٹھائے وہ چاچی کی طرف دیکھنا چاہتا تھا مگر نہیں دیکھ سکا۔

تھوڑی دیر بعد وہ باورچی خانے سے باہر نکلا۔ معمول کے مطابق اس نے کمرے سے چارپائی نکال کر صحن کی دھوپ میں بچھائی، پھرچاچے کو سہارا دے کرباورچی خانے سے نکالا اور صحن میں چارپائی پر لٹا دیا۔ آنکھیں مچمچاتا، بہ دقت سانس لیتا چاچا غفور اس لمحے اسے بچے کی طرح معصوم دکھائی دیا۔

نہ جانے کیوں نذیر نے ارادہ باندھا کہ وہ کبھی چاچی کو ایک نظر نہیں دیکھے گا۔

وہ چاچے کے پائینتی بیٹھ گیا اور اس کی ٹانگیں دبانے لگا۔

نذیر کو وہ ہڈیوں کا ڈھانچ معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے کبھی چاچے کی جسمانی حالت پر غور نہیں کیا تھا۔ اس نے کبھی اس کی آنکھوں میں بھی نہیں جھانکا تھا۔ اب تک وہ صرف اس کی آواز سنتا رہا تھا۔ اس کی بھاری اور گونج دار آواز ہی اس کے لیے چاچے کے مکمل وجود کا درجہ رکھتی تھی، جو سننے والے کو محکوم بنا دیتی تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ پاٹ دار آواز رکھنے والا شخص درحقیقت اس قدر کمزور بھی ہو سکتا تھا۔

چاچی خیرالنسا نذیر کے ناشتے کے لیے دیسی گھی سے بنے پراٹھے پر ساگ اور مکھن رکھ کر لے آئی۔ رکابی لیتے ہوے اس نے چاچی کی انگلیوں کے لمس کو اپنی ہتھیلی پر محسوس کیا۔ اس نے جھجکتے ہوے چاچی کے چہرے کی طرف دیکھا تو کچھ پریشان ہو گیا۔ وہ اپنی آنکھوں میں پوشیدہ جذبے کی چمک لیے اب بھی زیرلب مسکرا رہی تھی۔ اس نے جلدی سے رکابی تھام لی اور فوراً اٹھ کر دوسری چارپائی پر جا بیٹھا۔ وہ چارپائی کی ادوائن کے سوراخوں سے سرخ اینٹوں کے فرش کو دیکھتے ہوے نوالے چباتا رہا۔ اس دوران وہ اپنے آپ کو جبراً چاچی کی طرف دیکھنے سے روکتا رہا۔ وہ اپنے شوہر سے دوچار باتیں کر کے اس کی چارپائی پراً بیٹھی۔ نذیر نے اس کی آنکھوں کو خود پر گھومتے ہوے محسوس کیا تو نوالے چباتے ہوے اس کی زبان دانتوں کے نیچے آنے لگی۔ لذیذ ساگ اور پراٹھے کا مزہ خراب ہو گیا۔

اس نے نذیر سے کوئی بات نہیں کی، بس اپنی آنکھوں کے کونوں سے شریر انداز میں اسے دیکھتی رہی اور اسے دیکھتے ہوے اپنی چادر کے کونے کو شہادت کی انگلی پر لپیٹتی رہی۔ وہ بار بار اپنے دانتوں سے اپنے نچلے ہونٹ کو دبا رہی تھی۔ ایسے میں سانسوں کے زیروبم سے اس کی چھاتیاں دھیرے دھیرے لرز سی رہی تھیں۔

چاچا غفور اپنی چارپائی پر بیماری کے زیراثر غافل لیٹا ہوا تھا۔ وہ لاچاری سے ٹھنڈی سانس بھرتی ہوئی اٹھی اور تیز قدموں سے چلتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی نذیر نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ خود کو اس کی پشت دیکھنے سے باز نہیں رکھ سکا۔ چلتی ہوئی عورتوں کی پیٹھ دیکھنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ ایسے میں وہ کہیں گم ہو جاتا۔ عورت کی پشت کا نظارہ اسے چاند کی چودھویں شب اوس میں بھیگے ہوے کسی صحرا کی یاد دلاتا تھا، جس کی بھیگی ہوئی نرم نرم ریت پر وہ کچھ دیر سستانا چاہتا تھا۔ اس لمحے بھی اس کے دل میں ایسی ہی خواہش نے سر اٹھایا۔ خوابیدہ جذبے بیدار ہوے مگر وہ آہ بھرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکا۔ اس نے جلدی سے پراٹھے کا آخری نوالہ توڑ کر اپنے منھ میں ٹھونسا۔

اچانک چاچے غفور کے سینے سے خرخراتی ہوئی کچھ آوازیں سنائی دیں، جو اگلے لمحے کھانسی میں بدل گئیں۔ اس نے بہ دقت کروٹ لی اور زمین پر بلغم تھوکنے لگا۔

نذیر رکابی اٹھائے چاچے کے پاس آیا اور اس کا حال دریافت کیا۔ چاچے نے اس کی طرف دیکھے بغیر ہاتھ کا اشارہ کیا، جس کا مطلب تھا کہ میں ٹھیک ہوں، تم جاؤ۔ وہ باورچی خانے میں رکابی رکھنے گیا تو وہاں اس نے چاچی کو گھٹنوں میں اپنا سر دبائے ہوے دیکھا۔ وہ اس کی آہٹ سن کر چونکی اور اپنا سر اٹھا کر اسے دیکھتی ہوئی خوامخواہ مسکرانے لگی۔ اس کی زرد آنکھیں اوراداس چہرہ دیکھ کر وہ اپنا دل مسوس کر رہ گیا۔

اس کی حوصلہ افزائی کی خاطر وہ گویا ہوا۔ ”چاچی، پریشان مت ہو، چاچا شام تک بھلا چنگا ہوجائے گا۔“ اس کی یہ بات سن کر چاچی نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوے اپنا سر ہلا دیا۔

وہ باورچی خانے میں کچھ دیر ٹھہرنے کے بجاے فوراً وہاں سے باہر چلا گیا۔ چاچے کو خداحافظ کہہ کر وہ گھر سے نکلا اور دکان کی راہ لی۔

گھر سے نکلنے سے پہلے اس نے کہانیوں والا رسالہ بھی ساتھ لے لیا تھا۔ اس کی طبیعت دکان میں کوئی کام کرنے پر مائل نہیں تھی۔ اس نے سوچا کہ یعقوب کاریگر اکیلا ہی شادی والے کپڑوں کی سلائی کر دے گا اور اس کی تساہل پسندی کے بارے میں چاچے سے شکایت بھی نہیں کرے گا۔

راستوں پر تیز ی سے چلنا اس کا معمول تھا، مگر وہ آج گلی کی ڈھلان سے بہت آہستگی سے اُتر رہا تھا۔ وہ زیادہ سوچنے کا عادی نہیں تھا مگر اس وقت اس کے ذہن میں خیالات کی ایک گتھی الجھی ہوئی تھی جسے سلجھانا بہت ضروری تھا۔ وہ اسے جلدازجلد سلجھانا چاہتا تھا مگر درمیان میں کوئی چیز مزاحم تھی۔

گلی کے درمیان چلتے چلتے بےدھیانی میں وہ داہنی طرف بدرو کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ گلی لوگوں سے یکسر خالی تھی اور اس وقت یہاں سے مویشیوں کے کسی ریوڑ کو بھی نہیں گزرنا تھا۔ رفیق حجام کا بیٹا شلوار اتارے نالی پر بیٹھا ٹٹی کر رہا تھا۔ نذیر کو دیکھ کر وہ شرمانے لگا اور بیٹھے بیٹھے اس نے اپنا چہرہ قمیض کے دامن میں چھپالیا۔

نذیر نے اسے دیکھا تک نہیں اور اپنی دھن میں اس کے قریب سے گزر گیا۔

وہ سوچتا جا رہا تھا کہ اسے چاچے کے پاس رہتے ہوے چھ مہینے گزر گئے تھے۔ اس دوران اس نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی کہ چاچی خیرالنسا اس کے بارے میں کسی بدگمانی میں مبتلا ہو جاتی۔ وہ اسے اچھی لگتی تھی — بالکل جس طرح بھابی خدیجہ اسے اچھی لگتی تھی۔ چاچی کا جسم پرکشش تھا اور اسے چوری چھپے دیکھ کر وہ لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی اسے اچھی لگتی تھیں مگر وہ انھیں حسین خیال نہیں کرتا تھا۔

آج اس نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر اسے نیند سے جگایا تھا۔ کیوں؟ اس سے پہلے وہ ہمیشہ اسے آوازدے کر اٹھاتی تھی یا اس کی رضائی کو جھنجھوڑ دیا کرتی تھی۔ رکابی تھماتے ہوے اس کی انگلی کا لمس... اسے لگتا تھا کہ چاچی نے جان بوجھ کر اسے چھوا تھا۔

جب وہ نیا نیا یہاں آیا تھا تو چاچی خیرالنسا نے کبھی اس کے سامنے اپنے سر سے ڈوپٹہ نہیں اُتارا تھا۔ وہ اس کے سامنے قہقہہ لگانے سے بھی گریز کرتی تھی۔ وہ اس کی موجودگی میں کبھی انگڑائی بھی نہیں لیتی تھی۔ لیکن کچھ دنوں سے وہ ان چیزوں کے حوالے سے لاپروا ہوتی جا رہی تھی۔ اب وہ اس کے سامنے ڈوپٹے کے بغیر گھومتی اوربےنیاز ہو کر انگڑائیاں لیتی۔ اپنا لباس سرکنے سے بےخوف ہو کر وہ گھربھر میں جھاڑو لگاتی۔ اور تو اور، بعض اوقات وہ اس کے سامنے کھاٹ پر لیٹ جاتی اور قمیض کا دامن بھی درست نہ کرتی۔

چھ مہینوں سے نذیر کے ذہن میں اس خیال کی پھانس اٹکی ہوئی تھی کہ چاچا غفور ساٹھ برس کا تھا اور چاچی خیرالنسا اس سے پچیس سال چھوٹی تھی۔ وہ اکثر سوچتا رہتا تھا کہ وہ لاغراندام بوڑھے شخص کے ساتھ کس طرح نباہ کرتی رہی تھی۔

چلتے چلتے اسے چاچی کی انگڑائی یاد آئی اور پیشانی پر اس کے ہاتھ کا لمس۔ وہ مسکرانے لگا مگر جب اس نے آس پاس نظر ڈالی تو ٹھٹک کے رہ گیا۔ گلی سے نکل کر اسے بازار والی سڑک کی جانب مڑنا تھا لیکن وہ خیالوں میں چلتے چلتے قصبے کے آخری مکانات تک پہنچ گیا تھا۔ اسے اپنے سامنے گندم کے کھیت دکھائی دے رہے تھے۔

وہ اپنے آپ کو ملامت کرتا، گارے اور لکڑی کے مکانوں کو دیکھتا، واپس لوٹنے لگا۔ ایک بار پھر وہ خود کوسمجھانے لگا کہ اس کی جانب سے کسی قسم کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ خطرناک ہو سکتا تھا کیونکہ آخرکار چاچا غفور اس کے والد کا سگا بھائی تھا۔

بازار کی سڑک پر واقع پرائمری اسکول سے بچوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ اس نے محکمۂ بہبودِ آبادی کے دفتر کے باہر لگے ہوے بورڈ کو دیکھا جس پر چہروں کے بغیر مرد، عورت اور ایک بچہ بنے ہوے تھے۔ سڑک پر خاصی چہل پہل تھی۔

دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ دکانداروں کے چھڑکاؤ کی وجہ سے سڑک کیچڑآلود ہو گئی تھی۔ گردوپیش کے دیہات سے گدھاگاڑیوں، سوزوکیوں اور بسوں کے ذریعے قصبے میں لوگوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ چائے خانے بھرنے لگے تھے اور وہاں ٹیپ ریکارڈر پر مشہور گانے بجنے لگے تھے۔

چاچے غفور کی دکان سڑک کے آخری سرے پر چھوٹی سی گلی میں واقع تھی۔ اس گلی میں صرف درزیوں کی دکانیں تھیں۔ یعقوب کاریگرنذیر کو راستے میں ہی مل گیا۔ وہ دکان کی چابیاں لینے گھر جا رہا تھا۔ نذیر نے چاچا غفور کی صحت کے بارے میں اسے بتایا تو اسے تشویش ہونے لگی۔

یعقوب کاریگر نے دکان کا تالا کھولا تو نذیر نے شٹر اُٹھانے میں اس کی مدد کی۔ وہ یعقوب کا احترام کرتا تھا، اس لیے کہ ایک تو وہ ادھیڑعمر آدمی تھا اور پھر چاچے کا دوست بھی تھا۔ دکان کے بیشترمعاملات اسی کے ہاتھ میں تھے۔ لوگوں کی نظر میں دکان کا مالک چاچا غفور نہیں بلکہ یعقوب کاریگر تھا۔ کئی بہت پرانے گاہکوں کے ناپ اسے زبانی یاد تھے۔ جب انھیں ردوبدل کروانا ہوتا یا وہ نئے فیشن کا ڈیزائن بنواتے تو اپنی فرمائشیں اِسی کو بتاتے۔ وہ دھاگوں، بٹنوں اور بُکرم کی خریداری میں خودمختار تھا۔

اسے بہ یک وقت مردانہ اور زنانہ کپڑوں کی سلائی پر دَسترس تھی۔ مگر نہ جانے کیوں قصبے کی عورتوں میں وہ ایک مثالی درزی کی حیثیت سے مقبول تھا۔ دوردراز گوٹھوں کی عورتوں تک بھی اس کی مہارت کی شہرت پھیل چکی تھی۔ کپڑے سِلوانے والی خواتین دیر تک اس کی فضول باتیں بھی سنتی رہتی تھیں۔

نذیر یعقوب کاریگر کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کچھ عورتوں سے اس کے گہرے تعلقات تھے۔ شاید اسی لیے اتنی عمر گزرنے کے باوجوداِس نے شادی نہیں کی تھی۔

نذیر کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی تھی کہ دکان کا تالا اور شٹر وہی کھولے اور فرش کی صفائی بھی وہی کرے، لیکن یعقوب ہمیشہ ہی اس کا ہاتھ تھام لیتا تھا۔

”بابو، تم مالک، میں نوکر، یہ کام تمھارے لیے نہیں۔“

مگر آج نذیرنے اپنے دل میں کچھ اور ہی ٹھانی ہوئی تھی۔ اس نے دکان میں داخل ہوتے ہی جھاڑو اُٹھا لی اور صفائی کرنے لگا۔ یعقوب نے اس کے ہاتھوں سے جھاڑو لینے کی کوشش کی تو اس نے مصنوعی غصہ ظاہر کرتے ہوے اسے دکان سے باہر جانے کا اشارہ کر دیا۔ سفید بالوں والا کاریگر اپنے سیٹھ کے بھتیجے کا حکم سن کر ہنسی میں کندھے ہلاتا گلی میں جا کھڑا ہوا۔ اس نے قمیض کی جیب سے بیڑیوں کا بنڈل نکالا اور اسے اپنے ہاتھ سے نرمی سے دبانے لگا۔ پھر اس میں سے ایک بیڑی نکال کر اسے دانتوں میں چبا کر اس نے اسے سُلگایا۔

اس دوران نذیرنے کرسیوں، سلائی مشینوں اور میز کے نیچے سے کچرا صاف کیا۔ اس نے دھاگوں، لیروں اور بیڑی کے ٹکڑوں کو جمع کر کے اخبار میں سمیٹا اور اخبار کو دکان سے باہر پھینک دیا۔

یعقوب کاریگر آستینیں چڑھاتا دکان میں داخل ہوا اور اپنی مخصوص نشست پر جا بیٹھا۔ اس نے اپنی ٹانگیں کرسی پر سکیڑ لیں اور مزے سے بیڑی کے کش لیتا رہا۔ بیڑی ختم ہونے پر اس نے اسے چپل کے نیچے مَسل دیا۔ اس کے بعد میز کی دراز سے اگربتّی کا پیکٹ نکالا اور اس میں سے دو اگربتیاں نکال کر اس نے دیاسلائی کی مدد سے جلائیں، پھر زور سے پھونک مار کر اس نے اگربتیوں کے شعلے کو بجھایا اور ان کے خوشبودار دھویں میں لمبے سانس بھرنے لگا۔ یعقوب کے لیے صبح دکان کھولتے ہی اگربتی جلانا ایک مقدس رسم کی طرح تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگربتی کی خوشبو سے دکان پر پڑنے والا ہر قسم کے شر کا سایہ چھٹ جاتا ہے۔ اس نے سلگتی ہوئی ایک اگربتی کو میز کے کاؤنٹرمیں اٹکایا جبکہ دوسری کو دیوار کے رخنے میں لگا دیا۔

نذیر اپنی سلائی مشین صاف کر رہا تھا کہ اسے چاچے کی بات یاد آ گئی۔ سلائی مشین صاف کرتے ہوے اس نے اپنا ہاتھ روک لیا اور کاریگر سے مخاطب ہوا۔ ”وہ، ماسٹر طفیل شام کو کپڑے لینے آئے گا۔ اس کے پانچ جوڑے ہیں شاید،“ وہ ہچکچا کر بولا۔ بڑی عمر کے لوگوں سے بات کرتے ہوے وہ اعتماد کھو بیٹھتا تھا؛ اس کی نگاہ جھک جاتی تھی اور زبان میں گرہ پڑنے لگتی تھی۔

یعقوب نے اس کی بات سنی اور مسکراتے ہوے بولا، ”معلوم ہے۔ دو لیڈیز کے ہیں اور تین مردانہ جوڑے۔“

نذیر نے مطلوبہ دھاگے کی نلکی کو سلائی مشین پر چڑھایا اور دھاگے کو مختلف جگہوں سے گزار کر سوئی کے ناکے میں ڈال دیا۔ بیکار کپڑے کو سوئی کے نیچے رکھا اور مشین چلا کر ٹانکوں کا جائزہ لیتا رہا۔

گزشتہ صبح ہی ا نھوں نے ماسٹر طفیل کے کپڑوں کی کٹائی کر لی تھی اور شام تک آدھے جوڑوں کی سلائی بھی ہو چکی تھی۔ اب نذیر کا ہاتھ سلائی مشین پر رواں ہو گیا تھا۔ وہ اکیلا ہی شام تک بیٹھ کر پانچ جوڑوں کی سلائی کر سکتا تھا۔ مگر اس کا مزاج سیمابی تھا اس لیے اس کے لیے ایک جگہ دیر تک بیٹھنا مشکل تھا۔ یکسوئی سے کام کرتے کرتے اچانک اس پر بےقراری کا دورہ پڑتا اور وہ فوراً دکان سے باہر نکل جاتا؛کچھ دیر سڑک پر ٹہل کر اِدھراُدھر کی چیزوں کو دیکھتا اور پھر واپس آ کر اپنا کام کرنے لگتا۔

درزیوں کی اس گلی کی ہر دکان پر ٹیپ ریکارڈر اونچے سُروں میں بجتا تھا۔ ہر درزی اپنی پسند کے گانے سنتا تھا۔ نذیر بھی فلمی گانے سننے کا شوقین تھا۔ کئی مرتبہ وہ یعقوب کاریگر سے اپنی خواہش کا اظہار کر چکا تھا۔ اسے بھی موسیقی سننا پسند تھا مگر چاچے غفور کو موسیقی سے نفرت تھی۔ گلی میں کوئی درزی جب اونچی آواز میں گانے بجاتا تو چاچا غفور اسے گالیاں دینے لگتا اور ٹیپ بند کروا کے دم لیتا۔ مگر وہ درزی کچھ دیر بعد دوبارہ ٹیپ ریکارڈر بجانا شروع کر دیتا۔ چاچا غفور اس مرتبہ اٹھ کر جانے کے بجاے بیٹھا بڑبڑاتا رہتا۔

یعقوب کاریگر نے ایک اور شوق بھی پال رکھا تھا۔ اس نے کچھ ہٹ دھرمی اور کچھ بےشرمی سے اپنے اس عجیب شوق کی تکمیل کر لی تھی۔ اسے چاچا غفور کے طعنوں کی بھی پروا نہیں تھی۔ اس نے اخباروں، رسالوں، کتابوں اور پوسٹروں سے رنگین تصویریں کاٹ کاٹ کر دکان کی دیواروں پر چپکا دی تھیں۔ چھت سے فرش تک کوئی جگہ خالی نہیں چھوڑی تھی۔ تمام کی تمام تصاویر فلمی اداکاراؤں اور ٹی وی کی ماڈل لڑکیوں کی تھیں۔ وہ سب کی سب جوان اور پرکشش دکھائی دیتی تھیں۔ یعقوب کا یہ مشغلہ بہت پرانا تھا اور اس میں کبھی کمی نہیں آتی تھی۔ وہ ہر دوسرے دن ڈھونڈ ڈھانڈ کر کوئی نئی نویلی تصویر لے آتا اور اسے کسی پرانی تصویر کی جگہ لگا دیتا۔ گلی میں ایک اور درزی نے بھی اس کی دیکھادیکھی یہی شغل اختیار کر لیا تھا۔ وہ گاہے گاہے یعقوب کاریگر کو اپنی تصویروں کے معائنے کے لیے بلاتا رہتا اور اس کی رائے بھی معلوم کرتا۔

نذیر نے بےدلی سے کٹا ہوا کپڑا اُٹھایا اور سلائی کرنے لگا۔

گلی میں گاہکوں کی آمدورفت شروع ہو چکی تھی۔ یہ مختصر بند گلی شام تک لوگوں سے بھری رہتی تھی۔ دکانداروں نے دکانوں پر کپڑوں کے سائبان لگا رکھے تھے، جس کی وجہ سے گلی صبح سے شام تک سایہ دار رہتی تھی۔

چاچے غفور کی بیماری کی خبر پوری گلی میں پھیل گئی۔ تمام دکاندار نذیر سے اس کی خیریت دریافت کرنے آئے مگر واپس جا کر انھوں نے ٹیپ ریکارڈر اونچی آواز میں بجانا شروع کر دیے۔ ہر دکان پر مختلف گانا چل رہاتھا — ملی جلی آوازوں کے بیچ کسی گانے کے بول سمجھ نہیں آتے تھے۔

جب دکان کے آگے سے گزرنے والے کسی شخص کا سایہ اندر پڑتا تو نذیر بےاختیار ہو کر باہر دیکھنے لگتا۔ وہ احتیاط سے کیے جانے والے کام میں جلدبازی برتنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ تیزرفتاری سے سلائی مشین کے ہینڈل پر گھوم رہا تھا جبکہ دوسرا ہاتھ کپڑے کو تیزی سے آگے سرکاتا جا رہا تھا۔ سوئی چشم زدن میں کپڑے پر ٹانکے پر ٹانکا لگاتی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سلائی مشین روک دی۔

یعقوب کاریگرنے شلوار مکمل کر لی تھی۔ کچھ سستانے کے لیے اس نے نئی بیڑی سلگائی۔ نذیر اپنی نشست سے اُٹھا اور دکان کے سرے پر کھڑا ہو گیا۔ ہوٹل کا باہروالا کیتلی اور پیالیاں اٹھائے اس کے سامنے سے گزرا تو اس نے اسے دو چائے کے لیے کہہ دیا۔ پھر وہ دکان کے اندر آ کر یعقوب کاریگر کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ بیڑی کے کش پر کش لگاتا اپنی گدلی آنکھوں سے اپنے سامنے کھڑے نوجوان لڑکے کو دیکھتے ہوے مسکرایا۔

”آج کام میں دل نہیں لگ رہا،“ نذیرجھجکتے ہوے بولا۔

”تمھاری جو عمر ہے نا، اس میں یہ دل بڑا تنگ کرتا ہے، جب کہ یہ کام کرنے کے لیے پتہ مار کر بیٹھنا پڑتا ہے،“ وہ اپنی سفید اور سیاہ داڑھی کھجاتے ہوے بولا۔ ”پروا مت کرو۔ میرے ہوتے ہوے کوئی غم نہ کرو۔“

”چاچے کو نہ بتانا...“ نذیر نے اس سے درخواست کی۔ کاریگر نے یہ سن کرقہقہہ لگایا۔ اس کا قہقہہ سن کر نذیر بھی مسکرایا۔ وہ اسٹول کھینچ کر خوش مزاج کاریگر کے پاس بیٹھ گیا اور اس نے یونہی موسم کی شدت کا ذکر چھیڑ دیا۔

”اس مہینے سردی اور بڑھ جائے گی۔ سنا ہے کوئٹہ میں برف باری ہو رہی ہے!“

یعقوب کاریگرکندھے جھٹک کر ہنستے ہوے بولا، ”تمھارے چاچے کو اسی لیے ٹھنڈ لگ گئی... مگر یار، اس کے پاس تو بہترین ہیٹر ہے۔ اسے ٹھنڈ نہیں لگنی چاہیے تھی۔“

اس کی یہ بات سن کر نذیر نے شرما کر سر جھکا لیا۔

یعقوب اس کے گھٹنے پر ہاتھ مار کر قہقہے میں لوٹنے لگا۔ ”تم اب بچّے نہیں رہے۔ ماشا اللہ سمجھ دار ہو۔“

باتوں کے دوران چائے والا آ گیا۔ نذیر نے پیالیوں میں چائے ڈالی۔

کاریگرچائے پی کر اُٹھا اور انگڑائی لیتے ہوے اس نے اپنی کمر کا پٹاخہ نکالا۔

نذیر نے اسے انگڑائی لیتے ہوے دیکھا تو آج کی رات جو واقعہ پیش آنے والا تھا اس کے تصوّر سے اس کے خون میں سنسنی پھیل گئی۔ اس کا ذہن یعقوب کے فحش مذاق سے نکل کر یکایک کہیں اور پہنچ گیا۔ اسے چاچی خیرالنسا کا خیال تک نہ آیا کیونکہ اس کا ذہن خیالات کے ایک اور بگولے کی زد میں آ کر اِدھراُدھر بھٹکنے لگا تھا۔ وہ واقعہ جو پینتالیس روز قبل پیش آیا تھا، آج اپنے انجام کو پہنچنے والا تھا۔ وہ بالکل نہیں جانتا تھا کہ آج کی شب اس کی امیدوں کو بر آنا تھا یا انھیں ہمیشہ کے لیے ملیامیٹ ہونا تھا۔ اس کے علاوہ آج شب جو واقعہ رونما ہونے والا تھا اس سے اس کی زندگی کو بھی خطرہ لاحق تھا۔ اگر وہ اس سے کامیاب گزر گیا تو ٹھیک؛ ناکامی کی صورت میں اس کی موت بھی واقع ہو سکتی تھی۔

ڈیڑھ مہینہ پہلے چاچا غفور نے اسے پڈعیدن شہر ایک ضروری کام سے بھیجا تھا۔ وہ فجر کے وقت میرواہ سے نکلنے والی پہلی بس پر سوار ہو کر پہلے سیٹھارجہ پہنچا اور وہاں سے ٹرین پکڑ کر تقریباً دس گیارہ بجے پڈعیدن پہنچ گیا۔ اسے کام نمٹاتے نمٹاتے دوپہر ہو گئی۔ پھر ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد وہ سہ پہر کے وقت ریلوے اسٹیشن پہنچا اور ٹرین کا انتظار کرنے لگا جو پون گھنٹے بعد آنے والی تھی۔ بےچینی سے انتظار کرتے ہوے وہ پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔

پڈعیدن ریلوے اسٹیشن ایک جنکشن تھا، جہاں سے برسوں پہلے نوشہروفیروز، ٹھاروشاہ، کنڈیارو اور دیگر چھوٹے قصبوں کی طرف ریل جایا کرتی تھی، مگر اب بہت عرصے سے محکمۂ ریلوے نے اس راستے کو منسوخ کر دیا تھا؛ اب یہاں سے صرف مین لائن ٹرینیں ہی گزرتی تھیں۔ لیکن پڈعیدن ریلوے اسٹیشن کا پھیلاؤ اب بھی پہلے جیسا ہی تھا اور اب بھی اس کے نام کے ساتھ بہت سے اسٹیشنوں کی طرح جنکشن کا دم چھلا لگا ہوا تھا۔ اضافی لائنوں پر اکثر ایک یا دو انجن کھڑے شور مچاتے اور دھواں اگلتے رہتے تھے۔ پڈعیدن شہر ریلوے اسٹیشن کی عمارت کے عین مخالف سمت میں واقع تھا۔ وہ بھی اسی راستے سے پیدل چلتا ہوا یہاں پہنچا تھا۔

نذیر کی عادت تھی کہ وہ سفر کرتے ہوے کسی خوبصورت نسوانی چہرے کی تلاش میں رہتا تھا تاکہ اس کی آنکھوں میں جھانک جھانک کر اور اپنی آنکھوں سے اس کے چہرے کو ٹٹول ٹٹول کر بیزارکن اور اکتاہٹ سے بھرے سفر کو اہم ترین یاد میں تبدیل کیا جا سکے۔ یہ معاملہ ایک ریلوے اسٹیشن سے شروع ہو کر دوسرے پر ختم ہو جاتا تھا مگر اس کی یاد ہمیشہ ذہن میں محفوظ رہتی تھی۔ تین مرتبہ وہ اس معاملے کو طول دینے کی کوشش میں اذیت اور خواری کا تجربہ کر چکا تھا۔

اس کا مشاہدہ تھا کہ عورتیں بھی اس تفریح سے لطف اندوز ہوتی تھیں۔ انھیں اپنے دیکھنے والوں پر اپنی مسکراہٹ، ہنسی اور ادائیں نچھاور کر کے کوئی روحانی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ بعض عورتیں اپنے سینے کی نمائش کرنے سے بھی نہیں چوکتی تھیں، اسی لیے وہ باربار اپنے ڈوپٹے یا چادر کو درست طریقے سے اوڑھنے کا جتن کرتی رہتی تھیں اور اس طریقے سے مردوں کو لبھانے کی کوشش کرتی تھیں۔ ان خواتین پر اسے حیرانی ہوتی تھی جو مردوں کی گھورتی نظروں سے لاتعلق ہو کر شیرخوار بچوں کو دودھ پلانا شروع کر دیتی تھیں۔ وہ ہمیشہ ریل کے دوسرے درجے کی بوگیوں میں سفر کرتا تھا کیونکہ وہ ہجوم سے بھری ہوتی تھیں؛ اس طرح کبھی کبھار اسے کسی نسوانی جسم کو چھونے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ ان بوگیوں میں ہمیشہ نچلے اور نیم متوسط طبقے کی عورتوں کی بھرمار ہوتی تھی۔ نچلے طبقے والی خواتین لباس اور جسم کی صفائی سے بےنیاز ہوتی تھیں اور انھیں دیکھ کر گھن سی آتی تھی، جبکہ نیم متوسط طبقے کی عورتیں رنگین ملبوسات، اپنی پردہ پوشی، زیورات اور خوشبوؤں کے استعمال کی وجہ سے حقیقی نسوانی پیکر دکھائی دیتی تھیں۔ ان کی آنکھیں غمزوں کے ان دیکھے جہان آباد کرتیں۔ ان کے ہاتھوں اور بازوؤں کی سپیدی مردوں کی آنکھوں کو پوشیدہ نظاروں کے لیے تڑپاتی، جن کے دیدار کے نہ کوئی آثار ہوتے اور نہ امکان۔

پلیٹ فارم پر چہل قدمی کرتے ہوے اس نے ساری خواتین کو دیکھ لیا۔ اسے مایوسی ہوئی کیونکہ ان میں سے کوئی بھی اس کے معیار پر پوری نہیں اتری۔ اپنی جستجو کو مہمیز دیتے ہوے وہ پرلی طرف والے پلیٹ فارم کی جانب چلا گیا۔ وہاں پر اسے ایک حسین عورت نظر آئی۔ وہ کچھ دیر اسے تکتا رہا، مگر خاتون نے اس میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ نذیر نے محسوس کیا کہ اس کے التفات کی ندی کا رخ کسی اور جانب تھا۔ وہ شخص پتلون اور شرٹ میں ملبوس تھا اور اس نے چشمہ بھی لگا رکھا تھا۔ نذیر اسے دیکھ کر احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گیا کیونکہ اس نے کبھی پتلون شرٹ زیب تن نہیں کی تھی۔ وہ وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ وہ ایسی پرکشش، حسین اور مقامی نوجوان خاتون کی تلاش میں تھا جو انگریزی لباس پسند نہ کرتی ہو۔

پلیٹ فارم کے دونوں سروں کے درمیان چکر لگاتے ہوے اس نے ایک برقع پوش نوجوان خاتون کو منتخب کیا جوایک ادھیڑعمر عورت کے ساتھ پتھر کی نشست پر بیٹھی تھی۔ نذیر نے چائے کے اسٹال کے پاس کھڑے ہو کر انھیں کچھ دیر تاکنے کے بعد اندازہ لگا لیا کہ ان کے ساتھ کوئی مرد نہیں تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ نوجوان پردہ نشین اس کی مسلسل تاکاجھانکی کا برا نہیں مان رہی تھی بلکہ وہ بھی باربار اپنی نظروں کے تیر اس کی طرف پھینک رہی تھی۔ نذیر نے اس کا انتخاب اس لیے نہیں کیا تھا کہ وہ بھی مسلسل اس کی نظروں کا جواب دے رہی تھی بلکہ اسے اس کی گہری سیاہ آنکھیں اور اس کی کمان جیسی بھنویں بےحد پرکشش لگ رہی تھیں۔ نجانے کیوں وہ ان میں اپنے لیے پسندیدگی اور دلچسپی محسوس کر رہا تھا — ہو سکتا ہے یہ اس کی خوش فہمی ہو، مگر وہ جس طرح اسے دیکھ رہی تھی، اسے اس کے دیکھنے کا انداز بھا گیا۔ اس کا جوان حُسن اس کی آنکھوں سے آشکار تھا۔ وہ ٹکٹکی لگائے اس کے نازک سفید ہاتھوں، گلکاری والی چپلی میں محفوظ پیروں اور برقعے میں چھپے ہوے اس کے جسم کو دیکھتا رہا اور اس کے پوشیدہ حسن کی کشش کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر وہ اس کے بازوؤں کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی کلائی بہت نازک اندام اور اس کے ہاتھوں کی انگلیاں بہت گداز تھیں۔

نذیر چائے کے اسٹال پر کہنی ٹکا کر، اس کے حسن سے مبہوت، اسے تکتا ہی رہا۔ چائے کے اسٹال کا مالک من موجی مگر زیرک شخص تھا۔ وہ اس کی نیت فوراً بھانپ گیا۔ نذیر کے پاس آ کر اس نے اس کے کان میں سرگوشی سے کہا، ’’استاد! موقع اچھا ہے۔ اسے گرماگرم چائے پلا کر اس کے دل میں گرمجوشی پیدا کرو۔ دودھ پتّی چائے فس کلاس ہو گی اور اسے پلانا میرا کام ہے۔‘‘ اس کے منھ سے نسوار کی بُو آ رہی تھی اور وہ ہنستے ہوے اپنے بدنما دانتوں کی نمائش کر رہا تھا۔

اس کی پیشکش سن کر نذیر چونکا۔ اس نے شک بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔ اس نے اسے صرف اپنے لیے چائے لانے کے لیے کہا۔

پردہ نشین حسینہ کچھ دیر پہلے تک سکون سے بیٹھی اپنے فطری انداز میں آس پاس کی چیزوں کو دیکھ رہی تھی مگر اب اچانک اس کے وجود میں عجیب سی ہلچل نظر آنے لگی تھی۔ وہ بےچینی سے پہلو بدلنے لگی تھی اور باربار اپنے نقاب کو ہلا ہلا کر اس کی شکنیں درست کر رہی تھی۔ وہ بےاختیار ہو کر ذرا ذرا دیر بعد نذیر کو دیکھتی۔ اس کی ساتھی عورت سوگوار سے لہجے میں مسلسل کچھ بول رہی تھی۔ برقع پوش کی توجہ اس کی باتوں پر نہیں تھی، وہ ہوں ہاں کر کے اسے ٹال رہی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کی آنکھوں میں فطری نرمی کی جگہ ایک بےقراری لیتی جا رہی تھی۔

نذیر اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر چائے کے میٹھےپن کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ ابھی تک چائے کے اسٹال والے کی پیشکش میں الجھا ہواتھا۔ اسے برقع پوش کی توجہ حاصل ہو چکی تھی۔ اب وہ باربار اپنی گردن موڑ کر اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی اپنی طرف متوجہ بڑی بڑی آنکھوں کو دیکھتے ہوے نذیر کے خون میں پراسرار سی سرسراہٹ ہونے لگی تھی، جس کے باعث اس کی کنپٹیوں اور سر کے پچھلے حصے پر پسینہ آنے لگا تھا۔

بہت دیر سوچنے کے بعد نذیر نے اسٹال والے کو بلایا اور اسے چائے بنانے کے لیے کہا۔ اس نے طے کر لیا تھا، اب بات کو آگے بڑھانا چاہیے۔

برقع پوش کی ساتھی ادھیڑعمر عورت جو بظاہر اب تک ان دونوں کے معاملے سے لاعلم تھی، لگتا تھا شاید اب اسے اس معاملے کی بھنک پڑ گئی تھی۔ وہ وقفے وقفے سے اپنی مسکراتی ہوئی شریر نظروں سے نذیر کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

مٹی کے تیل سے جلتے چولھے پر چائے ابلنے لگی تو اسٹال والے نے دھلی ہوئی صاف پیالیوں میں دودھ پتّی انڈیل دی۔ مسکراتے ہوے اس نے نذیر کو آنکھ ماری مگر وہ اس وقت شدید بےچینی محسوس کر رہا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں پردہ نشین ناراض ہو کر انکار نہ کر دے یا غصے میں آ کر اسے گالیاں نہ دینے لگے۔ وہ ایسے اندیشوں میں گھرا چائے کے اسٹال سے پرے ہٹ گیا اور ان کی نشست کے بہت پیچھے جا کر ٹہلنے لگا۔ اس نے اپنی کلائی اٹھا کر گھڑی دیکھی تو ریل کے آنے میں اب بھی پندرہ منٹ باقی تھے۔

چائے اسٹال والا جھوم کر اپنی چال چلتا ان کے پاس پہنچا اور جھک کر سلام کرتے ہوے اس نے انھیں چائے پیش کی۔

برقع پوش نے ہچکچا کر نفی میں سر ہلایا اور بےاختیاری سے اس طرف دیکھنے لگی جہاں کچھ دیر پہلے وہ کھڑا تھا۔ اسے وہاں نہ پا کر وہ پریشان سی ہوئی۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا مگر وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہی رہا۔ اس کی اس کیفیت سے ادھیڑعمر خاتون لطف اندوز ہوتی رہی۔ اس نے معمولی سے ردوکد کے بعد چائے کے اسٹال والے سے پیالیاں لے لیں۔

چند منٹوں کے بعد نذیر زیرلِب مسکراتا ہوا دوبارہ اپنی جگہ پر آ کھڑا ہوا۔ اسے دیکھ کر برقع پوش کی آنکھوں میں خفگی کی شدید لہر دکھائی دی، جبکہ اس کی ساتھی عورت پہلے والی جگہ پر اس کی دوبارہ موجودگی سے محظوظ ہوتی، چائے کی سڑکیاں لیتی رہی۔

نذیر نے سوچا کہ جو عورتیں ناراض ہو جائیں انھیں منانے کا جتن بہرحال کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس نے ارادہ باندھا کہ اگر وہ سیٹھارجہ کے اسٹیشن پر اُتری تو وہ اسے منانے کی خاطراس کے گوٹھ، یا اگر ممکن ہوا تو اس کے گھر تک اسے چھوڑنے ضرور جائے گا۔

نذیر نے ممنون نگاہوں سے چائے اسٹال والے کی طرف دیکھتے ہوے اپنی جیب سے پیسے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔ پیسے لیتے ہوے اسٹال والے نے اس کے قریب آ کر آہستگی سے کہا، ”مرد کی شان ہوتی ہے کہ پسند آنے والی چیز کو اپنی مٹھی میں اچھی طرح کس لے۔ معشوق کے سامنے ڈٹ جائے اور کسی طرح پیچھے نہ ہٹے۔“ اس کی بات سن کر نذیر نے مسکراتے ہوے اثبات میں سر ہلایا۔

بہت دور سے ریل کی سیٹی سنائی دی تو پلیٹ فارم پر انتظار سے اونگھتے ہوے لوگ یک بہ یک ہوشیار ہو کر اس سمت دیکھنے لگے جدھر سے ریل آنے والی تھی۔ خوابیدہ اور خاموش پلیٹ فارم پوری طرح بیدار ہو گیا۔ سامنے کی پٹریوں سے سنائی دینے والی گڑگڑاہٹ کی آواز ٹرین کی آمد پر طوفانی گھن گرج میں تبدیل ہو گئی۔ پلیٹ فارم پر ٹرین کے رکتے ہی لوگوں نے اس پر سوار ہونے کے لیے کوششیں شروع کر دیں کیونکہ ٹرین مسافروں سے بھری ہوئی تھی۔ ہر بوگی کے دروازے پر لوگ آلتی پالتی مارے ہوے بیٹھے تھے۔

نذیر کی کوشش تھی کہ جس بوگی پر بھی وہ دونوں عورتیں سوار ہوں، وہ بھی ان کے آس پاس ہی اپنے لیے جگہ تلاش کرے۔ وہ دونوں ٹرین پر سوار ہونے کی تگ و دو میں آخری بوگیوں تک چلی گئیں۔ دروازوں پر قبضہ جمائے ہٹ دھرم لوگ انھیں سوار ہونے کے لیے راستہ دینے پر تیار نہیں تھے۔ نذیر کو ان لوگوں پر غصہ آیا۔ کچھ دیر بعد اس کی برداشت جواب دے گئی تو ایک بوگی کے دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے چیخناچلانا شروع کر دیا، تب کہیں جا کر انھیں اور اُسے بہ مشکل سوار ہونے کی جگہ مل سکی۔ نذیر چاہتا تو ہجوم کا فائدہ اُٹھا کر پردہ نشین خاتون کے جسم کو چھو کر ذرا سا محسوس کر سکتا تھا مگر اس نے اپنے آپ کو روکے رکھا اور ایسا کچھ نہیں کیا۔ پلیٹ فارم پر شتابی سے چلتے ہوے اس بےنام حسینہ کا جسم اسے بہت پرکشش لگ رہا تھا۔ اس کی کمر نشیب میں واقع کسی سرسبز و شاداب وادی کی طرح طویل مشاہدے کی متقاضی تھی۔ وہ پرامید تھا کہ آنے والا وقت اس پر ایسے مشاہدات کے بہت سے در وا کرنے والا تھا۔

انجن کا ہارن بجتے ہی ریل چل پڑی۔ ان کی بوگی لوگوں سے کھچاکھچ بھری تھی۔ گھسٹ گھسٹ کر آگے بڑھتے ہوے انھیں اور اسے آرام سے کھڑے ہونے کو تھوڑی سی جگہ مل گئی۔ وہ ان کے قریب کھڑا ہو گیا۔ ادھیڑعمر عورت اپنی پردہ نشین رفیق کی حفاظت کی خاطر ان دونوں کے درمیان کھڑی ہوئی تھی۔

کچھ فاصلے پر نذیر کو کنڈکٹرگارڈ دکھائی دیا۔ وہ فوراً اس کے پاس جا کراس سے نشست کے لیے درخواست کرنے لگا مگر وہ اسے روکھا سا جواب دے کر چلتا بنا۔ اس کے بعد اس نے گزرنے والے ایک پولیس کے سپاہی سے مدد چاہی تو اس نے تیس روپے کے عوض عورتوں کے لیے نشست کا بندوبست کر دیا۔ جب اس نے ادھیڑعمر عورت کو بتایا تو وہ حیرت سے اس کا منھ تکنے لگی۔ اس نے اپنی ساتھی خاتون کو اس کی پیشکش سے آگاہ کیا۔ اس نے اپنی مشکور نظروں سے نذیر کی طرف دیکھتے ہوے سر کے خفیف اشارے سے اس کا شکریہ ادا کیا، اور کسی ہچکچاہٹ کے بغیر وہ کچھ دور تک اس کے ساتھ جا کر اس نشست پر بیٹھ گئیں۔ وہ اس حسینہ کو اپنا قبلہ بنا کر ذرا فاصلے پر کھڑا ہو گیا، جبکہ وہ عورت احسان مندی سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

مختصر سے وقت میں یہ اس کی دوسری کامیابی تھی۔ وہ اس پر مسرور تھا مگر ساتھ ہی وہ یہ بات سوچ کر خوفزدہ بھی تھا کہ معلوم نہیں یہ دونوں کب اور کون سے اسٹیشن پر اتر جائیں۔ پڈعیدن سے سیٹھارجہ زیادہ دور نہیں تھا۔ درمیان میں صرف چار اسٹیشن پڑتے تھے۔ ہر اسٹیشن پر ریل کی رفتار کم ہونے پر اس کا دل ڈوبنے لگتا تھا اور جب گاڑی

وہاں سے نکلنے لگتی تو وہ کچھ مطمئن ہو جاتا تھا۔ یہ عارضی نااامیدی اور عارضی اطمینان اس کے لیے بہت اذیت ناک تھا۔

جب ٹرین محراب پور جنکشن سے نکلی تو وہ ایک مرتبہ پھر پرامید نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے ان کے چہروں پر بےچینی کے آثار نظر آنے لگے۔ ان کے باربار کھڑکی سے جھانکنے کے عمل سے اس کی ڈھارس بندھ رہی تھی۔
ڈیپارجہ کا گمنام اسٹیشن بھی چپکے سے گزر گیا اور اس کے بعد چھوٹی نہر بھی سرعت سے پیچھے چلی گئی۔
سیٹھارجہ آنے کو ہی تھا۔ ریل کی رفتار ایک بار پھر دھیمی ہونے لگی۔

اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا جب اس نے دیکھا کہ ان دونوں نے اپنا سامان اٹھا لیا تھا اور برقع پوش اپنے برقعے کو ٹھیک کرنے لگی تھی۔

ٹرین کے بریک چرچرائے اور اگلے ہی لمحے وہ تھم گئی۔

نذیر دقت سے ہجوم کے درمیان راستہ بناتا ہوا بوگی کے دروازے تک پہنچا اور لکڑی کی سیڑھیوں سے نیچے اُترا۔ وہ نیم پختہ پلیٹ فارم پر سفیدے کے قدآور درخت کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اگلے ہی ثانیے اس نے ان دونوں کو بوگی سے اترتے ہوے دیکھا۔ نیچے اُترتے ہی برقع پوش جوان عورت نے بھرپور نظر وں سے اسے دیکھا، آنکھیں گھما کر اسے ایک اشارہ کیا اور سیڑھیوں والے پل کی طرف چل دی۔ پل کے قریب پہنچ کر ان کی نگاہیں کسی کو ڈھونڈنے لگیں۔ ایک دُبلا شخص ہانپتا کانپتا ان کے قریب آ کھڑا ہوا اور کِھیسیں نکال نکال کر ان سے باتیں کرنے لگا۔ نذیر اس آدمی کو دیکھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا کہ اس کا ان سے کیا تعلق ہے؟ اس کا لباس میلاکچیلا تھا، سر کے بال بکھرے ہوے تھے اور چہرے پر شیو ابھری ہوئی تھی۔ اس نے پکوڑوں کا تھال اٹھایا ہوا تھا۔ وہ اپنی وضع قطع سے ادھیڑعمر خاتون کا شوہر معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہ اس سے لہک لہک کر باتیں کر رہی تھی۔ وہ دونوں آپس میں بہت بےتکلف دکھائی دے رہے تھے۔
نذیر کو محسوس ہوا کہ وہ اسے کہیں دیکھ چکا تھا۔ اس نے اپنے ذہن پر بہت زور دیا مگراسے یاد نہیں آ سکا۔

سیٹھارجہ کی آبادی بھی اسٹیشن کی عمارت کے مخالف سمت تھی۔ پل کے ذریعے سے انھوں نے پٹریاں عبور کیں اور آبادی کی طرف جانے والے راستے پر چلنے لگے۔ قصبے کی آبادی کچھ زیادہ نہ تھی۔ دائیں طرف محلے اور گلیاں واقع تھیں جبکہ بائیں طرف کچھ دور جا کر سیٹھارجہ کا بازار شروع ہوتا تھا۔ بازار کی دکانیں کولتار سے بنی نئی سڑک کے دونوں طرف واقع تھیں۔ گارے اور سرخ اینٹوں سے بنی دکانیں بہت پرانی اور خستہ حال تھیں۔ نئی سڑک کی وجہ سے ان کی سطح بہت نیچی ہو گئی تھی۔ شام ڈھلنے والی تھی اس لیے خریداروں کی تعداد براےنام تھی۔ قصبے کے لوگ یوں ہی اِدھراُدھر گھوم رہے تھے۔ کہیں کہیں بعض دکاندار کرسیاں بچھائے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ وقفے وقفے سے کوئی سائیکل، گدھاگاڑی یا موٹرسائیکل سڑک سے گزر جاتی تھی۔

وہ پردہ نشین اب چونکہ ایک مرد کی معیت میں تھی اس لیے اس سے نگاہیں ملانا بہت مشکل تھا۔ نذیر سوچ رہا تھا کہ ہو سکتا ہے وہ یہیں رہتی ہو اور شاید اچانک کسی گلی میں مڑ جائے۔ اگر ایسا ہوا تو اسے کم از کم برقع پوش کا پتا معلوم ہو جائے گا۔ وہ ان سے کچھ فاصلہ رکھ کر ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو اس پر کسی قسم کا شک گزرے۔ چلتے چلتے اچانک برقع پوش عورت نے اسے مڑ کر دیکھا۔ اس کے مڑ کر دیکھنے کو نذیر نے تعاقب جاری رکھنے کا اشارہ سمجھا۔ اسے اندازہ ہونے لگا تھا کہ وہ یقینی طور پر اس قصبے کی رہنے والی نہیں ہے۔

قصبے سے باہر نکلنے والی سڑک پر ٹھری میرواہ جانے والی پرانی ڈھرانی ایک بس کھڑی تھی۔ وہ تینوں اس پر سوار ہو گئے۔ بس چلنے میں ابھی دیر تھی۔ ذرا فاصلے پر نذیر کو ایک چھوٹی سی مانڈلی دکھائی دی۔ اس نے وہاں سے سگریٹ خرید کر سلگایا اور جلدی جلدی کش لے کر دھواں اُڑانے لگا۔

ابھی سگریٹ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ڈرائیور ہارن بجانے لگا۔ اس نے جلدی سے جوتے کے نیچے سگریٹ مسلا اور بس پر سوار ہو گیا۔ چند لمحوں میں بس چل پڑی۔ نذیر کو ان کے قریب کوئی خالی نشست نہ مل سکی۔

سڑک دو تین بل کھا کر قصبے سے باہر نکل جاتی تھی۔ قصبے کی آخری تعمیرات یعنی اسکول، ہاسپٹل، واٹر سپلائی، اور ٹاؤن کمیٹی وغیرہ پیچھے رہ گئے۔ پرانی گول باڈی بس کی کھڑکیوں کے شیشے اور چھت پر لٹکی آرائشی جھالریں ہل ہل کر مسلسل شور مچانے لگیں۔ بس کا انجن بھی شور مچانے لگا جبکہ بیٹھے ہوے اکثر مسافر اس ہنگامے سے بےنیاز اپنی باتوں میں مگن تھے۔

نذیر پیچھے بیٹھا ہوا باربار ان کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ برقع پوش وقفے وقفے سے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھ لیتی تھی، دو لمحوں کے لیے ہی سہی، وہ اس سے آنکھیں چار کر لیتا تھا، مگر آنکھیں چار کرنے سے اس کی تشفی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ان کے پاس تھال سنبھال کر بیٹھے ہوئے پکوڑافروش کی جگہ لینا چاہتا تھا، اس اجنبی عورت سے اس کا نام پوچھنا چاہتا تھا، اس کے ساتھ ہنسنا اور قہقہے لگانا چاہتا تھا۔ ایسی اور نجانے کتنی خواہشوں کی منھ زور لہریں تھیں جو اس کے دل کے ساحل پر باربار زور سے اپنا سر پٹخ کر لوٹ جاتی تھیں۔ وہ آہیں اور ٹھنڈی سانسیں بھرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

پکوڑافروش اور ادھیڑعمر عورت آپس میں جس طرح باتوں میں محو تھے، انھیں دیکھ کر اسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ یہ لوگ بھی اس کے ہمراہ بس کے آخری اسٹاپ پر ہی اُتریں گے۔

کھڑکھڑاتی ہوئی بس ہر چھوٹے بڑے بس اسٹاپ پر رکتی آگے بڑھ رہی تھی۔ مغربی افق پر سورج ڈوبنے سے پہلے آخری دم لے رہا تھا۔ اس کی رنگت گہری سرخ تھی لیکن اس کی روشنی ماند پڑتی جا رہی تھی۔ آسمان پر دور تک شفق پھیلی تھی، اس کی زردی اور سرخی نے زمین کو گلنار بنا رکھا تھا۔ کچھ دیر قبل اپنی جزئیات کے ساتھ دکھائی دینے والے کھجور، کیکر، شیشم اور سفیدے کے پیڑوں کے رنگ ماند پڑنے لگے تھے اور ان کی جزئیات غائب ہونے لگی تھیں۔ گندم کے نوخیز پودوں کی شوخ رنگت بھی شام کے ملگجےپن میں گم ہونے لگی تھی۔ راستے میں پڑنے والے مختلف گوٹھوں کے مکانوں سے اٹھنے والے دھویں کی بو، دھواں چھوڑتی بس کے ڈیزل کی بو سے گھل مل رہی تھی۔

نذیر پر بیزاری اور اکتاہٹ طاری ہونے لگی۔ اس نے برقع پوش کو ملامت کرتے ہوئے اپنا سر اگلی نشست کی پشت پر ٹکا دیا۔ اس کے ذہن میں پڈعیدن اسٹیشن سے شروع ہونے والے واقعے کی جزئیات گھومنے لگیں۔ اس نے خود کو احمق خیال کیا جو ایک حماقت پوری سنجیدگی اور تندہی سے انجام دیتا آ رہا تھا۔ وہ یہ بات بخوبی جانتا تھا کہ اسے آگے بیٹھی عورت سے محبت نہیں تھی، پھر کیوں پچھلے بہت سے وقت سے وہ اس کے خیالات و احساسات پر چھائی ہوئی تھی؟ اس نے خود کو سمجھایا کہ یہ معاملہ کھیل جیسا تھا، اس میں زیادہ سنجیدگی برتنا اصول کے خلاف تھا۔

بہت دیر بعد ایک بار پھر بالآخر پردہ نشین نے اسے مڑ کر دیکھا۔ نذیر کئی لمحوں سے اس کی آنکھیں دیکھنے کا منتظر بیٹھا تھا۔

سورج غروب ہونے کے بعد دھیرے دھیرے آسمان سے شفق بھی معدوم ہو گئی۔ اطراف میں اندھیرا پھیلنے پر بس کے اندر روشنیاں جلا دی گئیں۔ بس میں داخل ہونے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے بچنے کے لیے لوگوں نے کھڑکیاں بند کر لیں۔

بس ایک تاریک کھوہ میں سفر کر رہی تھی۔ گردوپیش کے تمام مناظر اندھیرے کی چادر میں چھپنے کی وجہ سے بس کا ماحول بےکیف اور یکساں ہو گیا، جس کی وجہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی نذیر کو اونگھ سی آ گئی۔ بہت دیر بعد جب بس ایک جھٹکے سے اپنے آخری اسٹاپ پر کھڑی ہوئی تو نذیر فوراً ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

اس نے ان تینوں کو بس سے اترتے دیکھا تو اس کی خوشی کا کوئی حساب نہ رہا۔ وہ اپنی توقع پوری ہونے پر مسرور تھا کہ وہ لوگ یہیں رہتے تھے۔ اب اسے پورا یقین ہو گیا کہ اس نے پکوڑافروش کو ضرور کہیں دیکھا ہو گا۔

دیگر قصبوں کی طرح ٹھری میرواہ کا بازار بھی ایک طویل سڑک پر واقع تھا۔ یہ طویل سڑک ایک جانب سے قصبے میں داخل ہو کر دوسری جانب سے میرواہ نہر تک چلی جاتی تھی۔ اس کے اطراف چھوٹی چھوٹی گلیوں کا جال بچھا تھا۔ رات ابھی شروع ہی ہوئی تھی مگر قصبے کی بیشتر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ چائے خانے تقریباً سبھی کھلے ہوئے تھے اور وہاں سے ٹی وی پر چلنے والے پروگراموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

بس سے اترنے کے بعد وہ تینوں اسی مرکزی سڑک پر چلنے لگے۔ نذیر ایک بار پھر ان کا تعاقب کرنے لگا۔

پہلے چاچا غفور کے مکان والی گلی اور اس کے بعد اس کی دکان والی گلی پیچھے رہ گئی، مگر اس نے پروا نہیں کی اور دھیرے دھیرے آگے بڑھتا رہا۔ اسے تجسس تھا کہ وہ تینوں کون سی گلی میں داخل ہوتے ہیں، مگر وہ لوگ کسی گلی میں داخل ہونے کے بجائے سیدھے چلتے چلے گئے۔ آگے جہاں سے سڑک بل کھا کر نہر کی طرف جاتی تھی، وہ تینوں اسی راستے کی طرف مڑ گئے۔ نذیر ان کے پیچھے، مگر ان سے خاصی دور، سڑک پر کھڑا انھیں دیکھتا رہا۔

نہر کے پُل سے پہلے قصبے کی آبادی ختم ہو جاتی تھی۔ نذیر تیزرفتاری سے دوڑتا ہوا پل تک پہنچا تو وہ لوگ پل سے اتر کر آگے بڑھ گئے تھے۔ نذیر ہانپتا کانپتا پل پر کھڑا انھیں تاریکی میں تحلیل ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ پل

سے اترنے والی کچی سڑک گوٹھ ہاشم جوگی کی طرف جاتی تھی۔ وہ تیرگی میں چھوٹے سے پل مبہوت کھڑا رہا۔ اسے پردہ نشین کی آنکھیں یاد آ رہی تھیں، وہ ایک بار پھر ان میں جھانکنا چاہتا تھا، انھیں جی بھر کر دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ ٹھنڈی سانس بھرتا پل کی دیوار پر بیٹھ گیا۔ اس کے لیے اس وقت آگے جانا ممکن نہیں تھا۔ پل کے نیچے سے گزرتے پانی کی وجہ سے وہاں بےحد خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دیوار سے اٹھ کر چند قدم اس طرف بڑھا جس طرف وہ لوگ گئے تھے۔ مزید آگے بڑھنے کی وہ ہمت نہ کر سکا۔ اس نے دور واقع گوٹھ کی طرف دیکھا جہاں دوچار ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

اس شب وہ سونے کے لیے محراب دار برآمدے میں چارپائی پر بچھے اپنے بستر پر لیٹا تو اسے محرابوں کی جگہ دو بڑی بڑی آنکھیں دکھائی دینے لگیں۔ کبھی وہ آنکھیں بازو بن کر اس کے وجود کے گرد پھیل جاتیں اور کبھی ہونٹ بن کر اس کی سماعت میں مبہم لیکن مسحور کر دینے والی سرگوشیاں کرنے لگتیں۔ نیند کے دوران خواب میں اس نے ان آنکھوں کو زیرِزمین غلام گردش میں تبدیل ہوتے دیکھا، وہ جس میں داخل ہوا تو پھر اسے وہاں سے نکلنے کا راستہ نہیں مل سکا۔ غلام گردش میں وہ ان آنکھوں کی مالکن کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گیا مگر وہ اسے کہیں دکھائی نہیں دی۔ صبح کو چاچی خیرالنسا نے جب اسے نیند سے جگایا تو وہ ہانپ رہا تھا اور اس کا چہرہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔

وہ آنکھیں اس کے اعصاب پر اتنی بری طرح سوار ہوئیں کہ اگلے کئی روز تک وہ گوٹھ ہاشم جوگی کے پھیرے ہی لگاتا رہا، لیکن اسے معلوم ہی نہیں ہوسکا کہ وہ پردہ نشین کون تھی اور کس کے گھر میں رہتی تھی۔ نذیر کبھی پیدل اور کبھی سائیکل پر گوٹھ کے آس پاس منڈلاتا رہا۔ وہ وقفے وقفے سے بہانہ بنا کر دکان سے چھٹی لیتا اور آدھے پون گھنٹے میں چکر لگا کر لوٹ آتا۔ ایک مرتبہ اس نے گوٹھ سے آنے والے راستے پر نگاہ رکھنے کے لیے گنے کے کھیت کو منتخب کیا۔ وہ بہت دیر تک وہاں دبک کر بیٹھا رہا اور گاؤں آنے جانے والوں پر نظر رکھتا رہا، مگر اسے خاطرخواہ کامیابی نہیں مل سکی۔ اس نے گوٹھ ہاشم جوگی آنے جانے والے تمام راستوں کا پتا چلایا اور وہ وہاں بھی پہرہ دیتا رہا، مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔

تین مرتبہ اسے برقع پوش عورتوں کو دیکھ کر اس پردہ نشین کا گمان گزرا۔ اس نے تندہی سے ان کا تعاقب کیا۔ ان کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا وہ نہر عبور کر کے قصبے کی طرف نکل آیا اور بازار کے اطراف کی گلیوں میں گھومتا پھرا۔ نذیر کے لیے عورتوں کو ان کی چال کے ذریعے پہچاننا مشکل تھا مگر جب اس نے ایک نظر ان کی آنکھوں میں جھانکا تو اسے فوراً پتا چل گیا کہ وہ برقعے کی وجہ سے دھوکا کھا گیا تھا۔

اسے اپنی کوششوں کے رائیگاں چلے جانے پر بےحد قلق تھا۔ وہ اپنے آپ سے خفا بھی تھا کہ اس معاملے میں وہ کس قدر انہماک سے مبتلا ہو گیا تھا۔ ا یک ایسی عورت کے لیے اس کی جستجو اور خواری کے کیا معنی؟ اس کے لیے جس سے ملاقات کرنا ناممکن، جسے دیکھنا شدید دشوار اور جس سے گفتگو کرنا بالکل محال تھا۔ اس نے خود کو ذلیل ترین آدمی تصور کیا۔ اس نے اپنے آپ سے پیمان باندھا کہ وہ آئندہ اس کے بارے میں بالکل نہیں سوچے گا۔ اس نے غصے میں آ کر اپنے آپ سے پیمان تو باندھ لیا مگر وہ اچھی طرح جانتا تھا، اس کی ذات کے پاتال میں پیوست دو آنکھیں اسے بےقراری سے اپنی جانب بلاتی رہیں گی اور ان کے بلاوے پر وہ اپنا پیمان، اپنا غصہ وغیرہ سب فراموش کر دے گا، اور ایک نئے عزم کے ساتھ پردہ نشین کی جستجو میں نکل پڑے گا۔

ایک دوپہر کو نذیر وڈیرے کریم بخش جلبانی کی حویلی میں سلائی شدہ کپڑے پہنچا کر لوٹ رہا تھا کہ اسے ایک گلی میں وہی پکوڑافروش اپنے پکوڑوں سے بھرے تھال سمیت نظر آیا۔ اسے دیکھتے ہی اس کے پائوں ساکت ہو گئے۔

پکوڑافروش ایک دیوار کے سائے میں تھال زمین پر رکھ کر بیٹھا تھا۔ اس کے آس پاس بچوں نے حلقہ بنا رکھا تھا اور شور مچا مچا کر وہ سب اس سے پکوڑے مانگ رہے تھے۔ وہ ان کی مانگ پر ہنستا ہوا اخباری کاغذ کے کٹے ہوے ٹکڑوں پر پکوڑے رکھ کر، ان پر مسالہ چھڑک کر بچوں کو تھما دیتا۔ جس بچے کو پکوڑے مل جاتے وہ اسے پیسے تھما کر بھاگ جاتا۔ اس کی چابکدستی کی وجہ سے تھوڑی ہی دیر میں بچوں کی بھیڑچھٹ گئی۔ پکوڑوں سے بھرا تھال تقریباً آدھا فروخت ہو چکا تھا۔ پکوڑافروش اپنی آمدنی کا حساب لگا کر پیسے اپنی جیب میں رکھنے لگا۔ اس دوران اس کی نظر اس سے کچھ فاصلے پر کھڑے نذیر پر جا ٹھہری، جو اس سے بظاہر لاتعلقی ظاہر کرتا، یوں ہی اِدھراُدھر دیکھ رہا تھا۔

پکوڑافروش ٹھنڈی سانس بھرتے ہوے اسے شک بھری نظر سے دیکھتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے کاندھے سے انگوچھا اُتار کر اپنے چہرے کی گرد صاف کرتے ہوے وہ منھ ہی منھ میں بڑبڑایا۔ اس نے کھڑے کھڑے جیب سے پولو فلٹر کا سگریٹ نکال کر سلگایا اور دو تین لمبے کش کھینچے۔ اس کے بعد وہ اپنے تھال کو سر پر رکھ کر وہاں سے چل پڑا۔

جانے سے پہلے اس نے ایک بار پھر نذیر کو مشکوک نظروں سے دیکھا مگر وہ دوسری جانب دیکھتا رہا اور اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ پکوڑافروش کے جانے کے بعد وہ مخمصے میں تھا کہ اس کا پیچھا کرے یا نہ کرے۔ اس دوران معاً اس کا ہاتھ اپنی جیب تک گیا تو وہاں چند نوٹوں کی موجودگی نے اسے مخمصے کے عالم سے نکالا۔ وہ تیزرفتاری سے اس سمت بھاگنے لگا جس طرف وہ گیا تھا۔

اگلی گلی کے موڑ پر اسے دور سے پکوڑافروش جاتا ہوا دکھائی دیا۔ تیز دوڑنے کی وجہ سے، بےحدّت دھوپ کے باوجود، نذیر کی بغلیں سلگنے لگیں اور وہاں سے بہتا پسینہ قمیض سے ہوتا اس کی شلوار میں داخل ہونے لگا۔ اسے لگ رہا تھا کہ جب وہ پکوڑافروش کے پاس پہنچے گا تو وہ قہقہے لگائے گا اور پوشیدہ بات آشکار ہو جائے گی۔ اپنا پسینہ خشک کرنے کی خاطر وہ دھیرے سے چلتا اس کا تعاقب کرنے لگا۔ آگے چل کرایک سایہ دار گلی میں اس نے پکوڑافروش کو آواز دی: ”پکوڑے والے، رکنا!“

وہ اپنے سر سے تھال اُتارے بغیر رک گیا اور پلٹ کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

نذیر آہستگی سے چلتا اس کے قریب آیا اور اس سے کھردرے لہجے میں پوچھنے لگا، ”تھال میں جو پکوڑے بچ گئے ہیں، وہ کتنے کے بیچو گے؟“

پکوڑافروش اس کے لہجے کے تحکم سے متاثر ہوا۔ اس کی آنکھوں سے شک کے سبب پیدا ہونے والی درشتی غائب ہو گئی۔ وہ اپنی نظروں سے تھال میں پڑے پکوڑوں کو تولنے لگا۔ ”سائیں وڈا! یہ سارے آپ اکیلے کھا نہیں سکیں گے۔“

نذیر گھورتے ہوے بولا، ”تمھیں اس سے مطلب؟“

”غلطی معاف! پورا تھال چھتیس روپے کا دے دوں گا۔“

”مطلب، پکوڑوں کے ساتھ تھال بھی؟“ اس نے مسکراتے ہوے پوچھا۔

پکوڑافروش عاجزی سے مسکرانے لگا۔ ”یہ تو میری روزی کا وسیلہ ہے، سائیں!“

”تم کوئی گاڈا یا ٹھیلا کیوں نہیں خرید لیتے؟“ وہ اس کے مرعوب ہونے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

”بوہتار! میں غریب آدمی ہوں، گاڈا خریدنا میرے بس سے باہر ہے،“ یہ بات کہتے ہوے اس نے تھال پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

نذیر نے اس کا نام پوچھا تو اس نے بتایا: ”نُورل جوگی۔“

سارے پکوڑے اخبار میں لپیٹنے کے بعد اس نے اپنے تھال کو فوراً اپنی بغل میں دبا لیا۔ اس نے یہ دیکھ کر خود کو مسکرانے سے بمشکل روکا۔ جب نورل نے اخبار میں لپٹے ہوے پکوڑے اس کی طرف بڑھائے تو نذیر نے پکوڑے لینے سے انکار کر دیا۔

اس کا انکار نورل جوگی کے لیے غیرمتوقع تھا۔ وہ باربار پلکیں جھپک کر اسے دیکھنے لگا۔ نذیر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پچاس کا نوٹ اس کی جیب میں رکھتے ہوے بولا، ”نورل، تم بہت اچھے آدمی ہو اور یہ تمھاری خرچی ہے۔“

اس کی بات سن کر وہ ہکابکا رہ گیا، پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ہاتھ جوڑ کر اس کا شکریہ ادا کیا۔

نذیر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور خوش دلی سے اسے ساتھ چلنے کی پیشکش کرنے لگا۔ ”آؤ! چل کر ہوٹل پر بیٹھتے ہیں۔“

یہ سن کر نورل کی باچھیں کھل اٹھیں۔ وہ نذیر کو صاحبِ ثروت خیال کرنے لگا۔ وہ تابعداری اور جی حضوری کے جذبات سے سرشار ہو کر اس کے ساتھ چلنے لگا۔ اس نے اپنی حیرت اور پریشانی نذیر پر ظاہر نہیں ہونے دی۔ وہ اندر سے سہما ہوا تھا کیونکہ اس وقت اس کی جیب میں تھوڑی سی چرس پڑی تھی۔ اسے خدشہ تھا کہ یہ نوجوان سخی بابو

کسی ایجنسی کا اہلکار نہ ہو اور پچاس روپے اور چائے کی پیشکش کے عوض نورل کو کہیں تین مہینے حوالات میں نہ کاٹنے پڑ جائیں۔ چائے خانے تک پیدل جاتے ہوے وہ اسے کریدنے کی کوشش میں اس سے الٹے سیدھے سوال پوچھتا رہا۔ نذیر بھی اس کی ذہنی کیفیت کو بھانپ چکا تھا۔ وہ اس کے بےتکے سوالوں کے بےتکے جواب دیتا رہا۔ وہ اس بات سے بھی بےنیاز ہو گیا کہ چھوٹے سے قصبے میں حقیقت کو چھپانا مشکل ہوتا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو یہ سوچ کر مطمئن کر لیا تھا کہ اس کا تعلق اس قصبے سے نہیں تھا۔ یہی سوچ کر اس نے دروغ گوئی سے کام لیتے ہوے نورل کے سامنے خود کو وڈیرے کریم بخش جلبانی کے دوست کا بیٹا ظاہر کر دیا۔ نورل نے اس کے جھوٹ پر یقین کر لیا اوراسے اطمینان ہو گیا کہ یہ چھوکرا اسے حوالات میں بند نہیں کروائے گا۔

چند چھوٹی بڑی گلیوں سے گزرتے وہ بازار تک پہنچے اور بازار سے گزر کر نہر کے وسیع و عریض بند پر واقع ایک چائے خانے تک۔ یہ میرواہ نہر کا دایاں کنارہ تھا اور آگے اس کنارے پر واقع کئی گوٹھوں کے لیے یہ بند کچی سڑک کا کام بھی دیتا تھا۔ اس سڑک پر گاڑیوں کی آمدورفت براےنام ہوتی تھی۔ اسی کا فائدہ اٹھا کر چائے خانے کے مالک نے سڑک پر کرسیاں بچھا دی تھیں۔ اس چائے خانے کے آس پاس چند خستہ سی دکانیں تھیں۔ کسی دکان میں حجام کام کر رہا تھا تو کسی میں بڑھئی۔ ان دکانوں کے عقب میں مکانوں کی طویل قطار ان سے متصل تھی۔ مکانوں کی یہ قطار تھوڑی دور جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ سب سے آخر میں محکمۂ آبپاشی کا ڈاک بنگلہ واقع تھا جبکہ سامنے، بائیں کنارے پر، کھیتوں کا طویل سلسلہ تھا جس کے درمیان کہیں کہیں چھوٹے بڑے گوٹھ نظر آتے تھے۔

نذیر بند پر درختوں کے نیچے بچھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے کا رخ گوٹھ ہاشم جوگی کی طرف تھا جہاں اسے متحیر کرنے والی، بےباک اور چمکدار دو آنکھوں کی جوڑی کی مالکن رہتی تھی۔ اس کے دل میں بسی برقع پوش کی یاد کی آگ دھیرے دھیرے آنچ دینے لگی۔ نورل بلاسبب اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتا، اپنا تھال اس کے سامنے رکھ کر چائے خانے کے اندر چلا گیا۔

نذیر کو اس سے بےحد اہم باتیں پوچھنی تھیں۔ وہ منھ بسورتے ہوے نہر کی طرف دیکھنے لگا۔ نہر میں پانی بہت کم تھا۔ کناروں کے اندر پانی سے زیادہ مٹی نظر آ رہی تھی۔ شیشم کے ٹنڈمنڈ درخت بند پر دور تک قطاروار کھڑے تھے۔

نورل جوگی نے واپس آنے میں کچھ زیادہ ہی دیر لگا دی مگر جب وہ آیا تو چائے کی پیالیاں ہاتھوں میں اٹھائے ہوے آیا۔ اس کی آنکھیں گہری سرخ ہو رہی تھیں اور اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا۔

نذیر فوراً بھانپ گیا کہ پکوڑافروش نے اندر ضرور چرس یا بھنگ کا نشہ کیا ہے اسی لیے اس کی یہ درگت بنی ہوئی ہے۔ نذیر نے مسکرا کر اسے دیکھا اور چائے کا گھونٹ لیتے ہوے اس سے چرس کا سگریٹ پلانے کی فرمائش کی۔ اس کی فرمائش سن کر پکوڑافروش نے قہقہہ لگایا اور کسی توقف کے بغیر جیب سے سگریٹ نکال کر اسے خالی کرنے لگا۔ اس کے ہاتھ سرعت سے کام کر رہے تھے۔ اس دوران وہ چند لمحوں کے لیے دنیا و مافیہا سے بےخبر ہوگیا۔ چرس کا سگریٹ بنانے کے بعد اس نے اپنے ایک ہاتھ پر دیاسلائی اور دوسرے پر چرس کا سگریٹ رکھ کر اسے پیش کر دیا۔ نذیرکو چرس پیتے دیکھ کر اس کے ذہن میں بسے دیگر شکوک و شبہات بھی ختم ہو گئے۔

نذیر پہلی بار چرس کے سگریٹ کو اپنے ہونٹوں سے لگا رہا تھا۔ اس نے جیسے ہی پہلا کش لگایا تو اسے محسوس ہوا جیسے اس کی چھاتی پر کسی نے زوردار مُکّا مار دیا ہو۔ وہ فوراً کھانسنے لگا اور اس کا سر اتنی تیزی سے چکرانے لگا کہ اس کی آنکھوں سے پانی رواں ہو گیا اور حلق میں کڑوا ذائقہ پھیل گیا۔ اس نے اپنے سر کو دو تین بار زور سے جھٹکا اور ایک لمحے کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد اس کے سر نے چکرانا بند کر دیا اور گردوپیش کی چیزوں کا گھومنا بھی تھم گیا۔

نورل بھاگتا ہوا گیا اور پانی سے بھرا گلاس لے آیا۔ اس نے پانی سے بھرا گلاس نذیر کو تھمایا۔ پانی کے چند گھونٹ پی کر اس کے حلق میں پھیلی تلخی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے بےحد اصرار کر کے نورل سے ایک مرتبہ پھر چرس کا سگریٹ لیا اور دو تین کش لگائے۔ اس بار بھی وہ کش کے ذریعے زیادہ دھواں نہیں کھینچ سکا۔

نورل اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر مسکراتے ہوے کہنے لگا، ”میرے سائیں، یہ فقیر فقرا کا پسندیدہ نشہ ہے۔ اس کے کش لگا کر آدمی کا ذہن عرش پر پہنچ جاتا ہے۔“

نذیر نے اس کی بات سمجھے بغیر اثبات میں سر ہلایا، مگر درحقیقت اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ اسے نورل جوگی سے بہت کچھ پوچھنا تھا مگر چرس کے چند کش لگا کر وہ اپنی جرأتِ اظہار کھو چکا تھا۔ اس کے لیے سوال پوچھنا تو

درکنار، بات کرنا بھی سخت دشوار ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ملامت کرتا ہوا پکوڑافروش سے بس اتنا ہی کہہ سکا: ”نورل، آج سے اپنی دوستی پکی۔ ٹھیک ہے؟“

”ہاں، بالکل ٹھیک ہے بوہتارا!“ اس نے تابعداری سے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد نذیر نے رخصت لیتے ہوے اسے خداحافظ کہا اور ڈگمگاتے قدموں سے ڈاک بنگلے کی طرف چل پڑا۔ وہ ایسی حالت میں دکان پر نہیں جانا چاہتا تھا۔ اسے خوف تھا کہ اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کرسب لوگوں کو پتا چل جائے گا کہ اس نے نشہ کیا ہوا ہے۔ وہ ڈاک بنگلے کے عقب میں واقع سرسبز قطعۂ زمین پر نیم کے گھنے پیڑوں کی چھاؤں میں کچھ دیر سستانے کی غرض سے دراز ہو گیا۔ خنک ہوا اور نشے کی وجہ سے اس کی آنکھیں مندنے لگیں اور اس کے اعصاب پر نیند کا خمار چھانے لگا۔

نذیر کو میرپور ماتھیلو سے ٹھری میرواہ آئے ہوے چھ مہینے سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ اسی لیے یہاں زیادہ لوگوں سے اس کی جان پہچان نہیں تھی۔ وہ اپنے والدین کی آٹھ اولادوں میں چوتھے نمبر پر تھا، اس لیے اس کے حصے میں ماں باپ کا اتنا پیار نہیں آ سکا جتنا اس کے سب سے بڑے بھائی اور سب سے چھوٹے بھائی کے حصے میں آیا تھا۔ اس کا بچپن اور لڑکپن ماں باپ اور بڑے بھائیوں کی گھرکیاں کھاتے ہوے گزرا۔ پانچ برس کی عمر میں جب اسے اسکول میں داخل کروایا گیا تو پہلے ہی دن ایک لنگڑے استاد نے کسی وجہ کے بغیر اسے تین زوردار تھپڑ رسید کیے۔ اب معلوم نہیں یہ استاد کے تھپڑوں کا اثر تھا یا اس کی طبیعت کا من موجی پن، کہ وہ آٹھویں جماعت سے آگے نہیں پڑھ سکا۔ اسکول کو خداحافظ کہنے کے بعد اس نے آوارہ گردی کا شغل اپنایا۔ وہ صبح سے شام تک میرپور ماتھیلو کے گلی محلوں کی خاک چھانتا پھرتا۔ اپنی والدہ کی ڈانٹ ڈپٹ کو وہ خاطر میں نہیں لاتا تھا، مگر اپنی آوارہ گردیوں کی وجہ سے وہ اکثر اپنے بڑے بھائیوں کے ہاتھوں مار کھاتا۔ اس کے والد میرپور ماتھیلو کے مشہور حلوائی تھے اور وہاں ان کی مٹھائی کی بہت بڑی دکان تھی۔ اس کے تین بڑے بھائی دکان پر والد کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ نذیر کی آوارہ گردیوں سے تنگ آ کر اس کے والد نے اسے بھی دکان پر رکھ لیا۔ اس کی عمر کا یہ وہی دورتھا جب اپنی ہم عمر لڑکیاں بلا کسی سبب کے اچھی لگنے لگتی ہیں۔ راہ چلتے ہوے کسی حسین دوشیزہ کی ایک جھلک ہی اسے راستے سے بھٹکانے کے لیے کافی ہوتی تھی۔ وہ اپنے والد اور بھائیوں کے بتائے ہوے کام فراموش کر کے اس حسین دوشیزہ کو اس کے گھر تک پہنچانے کا فریضہ انجام دینے لگتا تھا۔ بعد میں جب اس کے بھائی اور والد کام میں ہونے والی تاخیر کے متعلق دریافت کرتے تو وہ بغلیں جھانکنے لگتا۔ ایسے میں اس کے بھائیوں اور والد کے طمانچے اس کے چودہ طبق روشن کر دیتے۔ گھر پہنچ کر وہ اپنی ماں کو بھائیوں اور والد کی اس کارگزاری کے بارے میں بتاتا تو وہ دکھ اور افسوس سے اس کے سرخ گالوں پر اپنے ہاتھ پھیرتی۔

نذیر کے بھائی اور والد اسے کبھی شہربدر نہ کرتے اگر وہ میرپور ماتھیلو کے چکلے کی بدنامِ زمانہ رنڈی زوری کی زلفوں کا اسیر نہ ہو جاتا۔ وہاں کا راستہ اسے ایک دوست نے دکھایا، اس کے بعد وہ خود ہی آنے جانے لگا۔ مگر زوری بہت منھ زور تھی۔ اس جیسے کم عمر بالک پر اپنی نظرِ الفت ڈالنا اسے اپنے شایانِ شان نہیں لگتا تھا۔ ہر مرتبہ وہ تھوڑی دیر تک زوری کا دیدار کر کے لوٹ آیا۔ ایک روز اس کے والد نے اسے پچاس ہزار روپے بینک میں جمع کروانے کے لیے دیے، مگر اس کے دل میں نہ جانے کیا سمائی کہ وہ رقم جیب میں لیے چکلے پہنچ گیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد جب اس نے زوری کے سامنے نوٹوں کی گڈی نکالی تو وہ اس پر توجہ کرنے پر مجبور ہو گئی۔ مگر وہ بھی ایک گھاگ عورت تھی، نذیر جیسے نوخیز لڑکے کو بہلانا اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ وہ شام تک اسے اپنی لچھےدار باتوں سے بہلاتی رہی۔ دوسری طرف دکان پر اس کے واپس نہ آنے پر ڈھنڈیا مچ گئی۔ اس کے بھائیوں نے اس کے دوستوں سے مل کر اور انھیں کرید کر پتا چلا لیا کہ اس وقت وہ کہاں چھپا بیٹھا ہے۔ انھوں نے اپنے والد کی معیت میں چکلے پر چھاپہ مارا تو وہ زوری کے کمرے سے برآمد ہوا۔ اس کے بھائیوں اور والد نے زوری کو دھمکیاں دے کر اس سے سارے پیسے نکلوا لیے اور نذیر کو پیٹتے ہوے وہاں سے لے گئے۔ اس واقعے کے اگلے دن اس کے والد نے اس کی حرکتوں سے نالاں ہو کر اسے اپنے چھوٹے بھائی کے پاس ٹھری میرواہ بھجوا دیا۔

نورل پکوڑافروش سے اگلی دو ملاقاتوں میں بھی نذیر اپنے دل و دماغ میں پیوست آنکھوں کی مالکن کے متعلق کوئی بات نہیں پوچھ سکا۔ مگر نورل سے اس کی دوستی مضبوط ہو گئی تھی۔ وہ مطمئن تھا کہ مسحورکن آنکھوں والی کا شجرۂ نسب معلوم کرنا اب اس کی دسترس میں تھا۔ مگر اسے یہ احساس بھی شدت سے تھا کہ اس معاملے میں اسے مزید تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ یہی سوچ کر ایک روز نذیر نے شام ڈھلے نورل کو نہر کے کنارے اسی ہوٹل پر بلایا۔ یہ ان کی چوتھی ملاقات تھی۔ نذیر چاہتا تھا کہ اس عورت کے بارے میں آج ساری تفصیلات معلوم کر کے کوئی نہ کوئی حتمی فیصلہ کر لے، کہ اسے اس عورت تک رسائی کے لیے کوشش کرنی چاہیے یا اس کی یاد کو ہمیشہ کے لیے طاقِ نسیاں پر رکھ دینا چاہیے۔ اپنی پہلی غلطی کے خمیازے کے طور پر نذیر کو ہر ملاقات پر اس کے ساتھ چرس کا سگریٹ پینا پڑ رہا تھا۔ اس نے نورل کو خوش کرنے کے لیے اسے بتایا کہ وہ اسے دیکھتے ہی پہچان گیا تھا کہ یہ آدمی ایک موالی ہے — اسی وجہ سے تو اس نے اس کے ساتھ دوستی کی تھی۔ نورل اس کی یہ بات سن کر اپنے آپ پر فخر محسوس کرنے لگا۔ نذیر گزشتہ ملاقاتوں کی طرح اس بار بھی اس سے تفصیلات معلوم کرنے میں ناکام رہا۔ اسے اپنی کم ہمتی پر غصہ آ رہا تھا

کہ وہ ایک معمولی سے آدمی کے سامنے کھل کر بات کرنے سے گھبرا رہا ہے۔ اسے دل ہی دل میں یقین تھا کہ وہ جب بھی پکوڑافروش سے اس بابت دریافت کرے گا، وہ اسے کسی ردوکد کے بغیر سب کچھ بتا دے گا۔ مگر چرس کے سگریٹ پینے کے بعد وہ نجانے کیوں گھگھیانے لگتا تھا۔ عام سی باتیں کرتے ہوئے بھی اس کی زبان میں گرہ لگ جاتی تھی۔ اس نے چرس پر تمام الزام رکھ کر اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دینے کی کوشش کی۔ مگر وہ بھول رہا تھا کہ ایک مرتبہ بھی نورل نے اسے چرس پینے کی پیشکش نہیں کی تھی بلکہ ہر بار اسی نے اصرار کر کے اس سے چرس پینے کی خواہش کی تھی۔

نذیر دھیرے دھیرے چرس کا عادی ہونے لگا تھا۔ اسے اس نشے میں لطف آنے لگا تھا۔ اس کے چند کش لگانے کے بعد وہ خود کو پردہ نشین کے قرب میں محسوس کرنے لگتا تھا۔ وہ اس کے ذہن و دل میں ایستادہ دھیرے دھیرے اپنا نقاب اتارتی تو وہ مبہوت ہو کر اس کے جمال کا مشاہدہ کرنے لگتا تھا۔ اس کا مکمل چہرہ اسے اس کی آنکھوں سے زیادہ تابناک محسوس ہوتا۔ ایسے لمحوں میں اسے یقین ہونے لگتا کہ یہ حسینہ غیرزمینی جمال لے کر اس کرۂ ارض پر اتری ہے۔ نذیر ہولے ہولے برقع پوش کی حقیقت سے زیادہ اس کے خیال کی لو سے متاثر ہو رہا تھا۔

اسی لیے نذیر پکوڑافروش کے ساتھ ایسی تمام جگھوں پر جانے لگا جہاں موالی اکٹھے ہوتے تھے۔ نورل کے ساتھ اسے ہر جگہ خوش دلی سے قبول کیا جاتا اور ان دونوں کی چرس اور چائے سے خوب آؤبھگت کی جاتی۔

چرس کے زیادہ استعمال کی وجہ سے نذیر احساسِ جرم محسوس کرنے لگا۔ اس عرصے میں چاچا اور چاچی نے کئی مرتبہ اس سے اس کی صحت کے بارے میں پوچھا مگر اسے ہر بار جھوٹ بول کر انھیں جھانسا دینا پڑا۔

نذیر کے دوست حیدری کو بھی اس گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔ نذیر نے ایک دن اس کے پاس جا کر پڈعیدن اسٹیشن سے شروع ہونے والے اس قصے کی مکمل تفصیلات بتا دی تھیں اور اس کے بعد کے معاملات سے بھی اسے باخبر رکھتا رہا تھا۔ حیدری نے ہر مرتبہ اس کی سادہ لوحی کا مذاق اڑایا کیونکہ وہ پکوڑافروش کو اچھی طرح جانتا تھا۔ نذیر نے حیدری کی منت سماجت اور خوشامد کر کے اسے اپنی مدد کرنے پر آمادہ کر لیا۔ حیدری نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اسے اپنے ساتھ دکان پر لے آئے۔

نذیر شام کی نیم تاریکی میں ہوٹل پہنچا تو اس نے دیکھا کہ نورل شیشم کے درخت کی آڑ میں بیٹھا ہوا چرس کا سگریٹ بنا رہا تھا۔ اس کے سر پر مچھروں کا غول منڈلا رہا تھا مگر وہ اس سے بےپروا، سگریٹ بھرنے میں مگن تھا۔ نذیر نے اسے دیکھتے ہی کہا، ”تم یہاں چھپ کر بیٹھے ہو؟“

نورل گردن موڑ کر اسے دیکھتا مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے چرس کے تازہ تازہ سگریٹ کو اپنے انگوٹھے کے ناخن پر آخری مرتبہ ٹھوکا اوراگلے ہی لمحے وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا، ”میں چھپ کر نہیں، سرِعام بیٹھا ہوں اور مجھے یہاں بیٹھے ہوئے بہت دیر ہو چکی ہے۔“

نذیر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، ”میں بندوبست کرنے میں مصروف تھا۔“

اس کی بات سن کر نورل چونکا۔ ”کس چیز کا بندوبست؟“

”ایک بہت ہی خاص چیز کا۔ تم اٹھ کر میرے ساتھ چلو۔“

اس نے سگریٹ کے کش کھینچ کر اسے نذیر کی طرف بڑھا دیا۔ ”پہلے اسے پی لیں، اس کے بعد چلتے ہیں۔“

سرد ہوائوں کی وجہ سے بڑھنے والی خنکی کے سبب چائے خانے کا عملہ اندر تھا۔ ویران اور کچی راہگزر پر چند کرسیاں پڑی تھیں۔ نہر سے اتر کر گوٹھ ہاشم جوگی جانے والا راستہ دھول سے اٹا تھا۔ دھند اور دھویں کی دبیز تہہ گوٹھ کے مکانوں کے گرد حصار بناتی ٹھہر سی گئی تھی۔ آسمان پر شفق کی سرخی، سرمئی رنگ میں تبدیل ہو کر، آہستہ آہستہ مغرب سے امڈتی ہوئی تاریکی میں جذب ہوتی جا رہی تھی۔ سگریٹ کا آخری کش لگا کر نورل نے سگریٹ کا ٹکڑا نہر کی طرف اچھال دیا، پھر اپنے دونوں ہاتھ اپنے سر کے اوپر لے جا کر تالیاں بجا کر مچھروں کو مارنے لگا۔ اس کی یہ حرکت دیکھ کر نذیر نے ہنستے ہوئے اسے دھکا دیا۔ نورل نے خود کو گرنے سے بمشکل بچایا۔ اس کے بعد وہ دونوں بازار کی طرف چل پڑے۔

نہر کے پُل کے قریب گھورے پر کتّے اور بلیاں اپنے پنجوں کی مدد سے اپنے لیے خوراک ڈھونڈ رہے تھے۔ دن کے وقت پل کے اطراف پھلوں اور کھانے پینے کی اور چیزوں کے ٹھیلے لگے ہوتے تھے اور یہاں کھانے کے شوقین لوگوں کا ہجوم رہتا تھا، مگر شام ڈھلنے سے پہلے پہلے یہاں کی رونق ختم ہو جاتی تھی۔ اس وقت پُل کی دیوار پر بیٹھ کر دو لڑکے آپس میں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

ایک کتے اور کتیا کو جفتی کرتے ہوے دیکھ کر نورل نے قہقہہ لگایا، پھر ایک پتھر اٹھا کر ان کی طرف پھینکتے ہوے پل سے اترنے والی ڈھلان پر دوڑتا چلا گیا۔ نذیر نے مذاقاً اسے ایک گالی سے نوازا۔ شام کے وقت بازار کی دکانیں بند ہونے کی وجہ سے سڑک بہت کشادہ معلوم ہو رہی تھی۔ سڑک پر کچھ دور جا کر وہ دونوں داہنی طرف واقع ایک گلی کی طرف مڑ گئے۔ اس گلی میں حیدری کی تمباکو کی دکان تھی۔

حیدری اپنی دکان کھولے بیٹھا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اپنے والد کو بہت دیر پہلے گھر بھیج دیا تھا۔ وہ ان کے انتظار میں باربار اٹھ کر سڑک پر نگاہ ڈالتا اور بیٹھ جاتا۔ مختصر سی دکان بہت خستہ حال تھی۔ گلی میں اس کے دروازے کے نیچے سے ایک بدرو گزرتی تھی۔ حیدری کا باپ اس بدرو کی وجہ سے ٹاؤن کمیٹی والوں کو کوستا رہتا تھا کیونکہ اس کے سبب دکان کی بنیادوں اور دیواروں میں سیلن آ گئی تھی۔ دکان کے فرش پر تمباکو کی کھلی ہوئی بوریاں پڑی رہتی تھیں جس کی وجہ سے تمباکو کی گہری خوشبو اس کے درودیوار میں رچی بسی ہوئی تھی۔

حیدری ایک بار پھر اٹھا، اس نے الماری کے پاس جا کر اس کا ایک پٹ کھولا اور وہاں رکھے ہوے لفافے کو ٹٹولنے لگا۔ لفافے میں موجود شے کو محسوس کر کے اسے اطمینان سا ہوا۔

نذیر نالی پھلانگ کر دکان میں داخل ہوا، جبکہ نورل نے چھلانگ لگا کر بدرو پار کی اور اندر داخل ہوا۔ تمباکو کی گہری بو کے زیرِاثر نورل لگاتار چھینکیں مارنے لگا۔ مسلسل چھینکنے سے اس کی جو حالت ہو رہی تھی اس سے محظوظ ہوتے ہوے وہ دونوں ہنسی میں لوٹنے لگے۔ نورل نے سو کینڈل پاور کے بلب کی زرد روشنی میں دکان کا جائزہ لیا تو وہ اسے قبر جیسی معلوم ہوئی۔ قبر کا خیال آتے ہی اس نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا اورزیرلب توبہ توبہ کرنے لگا۔ نذیر نے اسے تمباکو سے بھری بوری پر بٹھاتے ہوے بتایا کہ انھوں نے اس کی دعوت کے طور پر اس کی خاطر شراب کا بندوبست کیا ہے۔
شراب کا ذکر سنتے ہی نورل نے اٹھ کر فوراً جیے شاہ نورانی اورجیے لاہوتی کا نعرہ بلند کیا۔ حیدری نے اسے جھڑکا کہ گلی سے گزرنے والے لوگ بلاسبب ان کی طرف متوجہ ہو جائیں گے اور یہ دعوتِ بادہ و ساغر برباد کر دیں گے۔ جھڑکی سننے کے بعد نورل نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔ اس کی آنکھوں میں حریصانہ چمک واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ حیدری ایک بار پھر اٹھ کر الماری تک گیا اور اس کا ایک پٹ کھول کر لفافہ باہر نکالا اور اس کے ساتھ ہی پانی سے بھرا جگ اور تین خالی گلاس بھی نکال لیے۔ نذیر نے حیدری کے ہاتھ سے لفافہ لے لیا اور اس میں سے بوتل نکال کر نورل کو دکھانے لگا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کانچ کی بوتل اور اس میں بھرے آتشیں محلول کو دیکھنے لگا۔

نذیر اس کا تجسس مزید بڑھانے کے لیے اسے بتانے لگا:’’اس شراب کا انگریزی نام لائن ہے۔ لائن کو سندھی زبان میں شینھ کہتے ہیں۔ مطلب، اسے پینے کے بعد آج کی رات تم شیر بن جاؤ گے۔ بس ہم دونوں کا خیال رکھنا، باقی سب خیر ہو گی۔‘‘

اس بات پر وہ تینوں بےساختہ ہنسنے لگے۔ نورل جوگی نے اچھی طرح بھانپ لیا کہ یہاں کا ماحول دوستانہ ہے۔ اس کا فائدہ اٹھا کر وہ انھیں اپنی شراب نوشی کی تاریخ سنانے لگا۔ وہ پلاسٹک کی بوتلوں میں ملنے والی دیسی شراب اب تک سات مرتبہ پی چکا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں پہلی بار شیشے کی بوتل والی شراب پی رہا تھا۔ وہ اس قدرافزائی کے لیے نذیر کا بےحد ممنون تھا۔

حیدری نے ناپ تول کر شراب کے تین پیگ بنائے اور اس کے بعد ان میں پانی ملانے لگا۔ جب وہ نورل کے پیگ میں پانی ڈالنے لگا تو اس نے اس کا ہاتھ روک لیا اور اسے اپنی شراب میں پانی نہیں ملانے دیا۔ تینوں نے اپنے اپنے گلاس تھام لیے اور چسکیاں لے لے کر پینے لگے۔

حیدری نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ مارتے ہوے اس سے پوچھا، ’’نورل ! ہمیں بتاؤ۔ کبھی تم نے کسی سے محبت کی؟‘‘

پکوڑافروش تو پہلے سے ہی موج میں تھا۔ شراب کی وجہ سے اس کا نشہ دوآتشہ ہو گیا تھا۔ وہ انھیں قصبے میں بھیک مانگنے والی باگڑی عورتوں کے متعلق بتانے لگا، چند روپوں کے عوض وہ جن سے مباشرت کر چکا تھا۔ ان عورتوں میں سے ایک لچھمی اسے آج بھی بہت یاد آتی تھی۔ وہ جب اس سے ملا تھا تب وہ سولہ سال کی تھی اور اس کے تن پر جوانی کی باڑھ آئی ہوئی تھی۔ اس سے ملنے والی لذت کو وہ آج بھی اپنے رگ و ریشے میں محسوس کرتا تھا۔

نورل کے بعد حیدری اپنا فرضی معاشقہ سنانے لگا۔ اس دوران نذیر گم سم بیٹھا رہا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر نورل نے ہنستے ہوے کہا، ”مجھے لگتا ہے، یہ محبت میں ناکام ہو گیا ہے۔ یا پھر کسی نے اس کے ساتھ محبت ہی نہیں کی۔“ وہ اپنے سوال پر خود ہی کھیسیں نکالنے لگا۔

نذیر گلاس سے گھونٹ بھر کر سنجیدگی سے بولا، ”میرا دل ایک پردہ نشین کی آنکھوں میں غرق ہو چکا ہے۔ وہ پڈعیدن سے ٹرین میں آتے ہوے مجھے راستے میں ملی تھی۔“ اس نے جان بوجھ کر پڈعیدن کا ذکر کیا تھا تاکہ نورل کوئی ردعمل ظاہر کرے، مگر وہ اس شراب سے طاری ہونے والی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

یہ بات سن کر حیدری چونکا جیسے اسے بہت اہم کام یاد آ گیا ہو۔ وہ جلدی سے پکوڑافروش سے مخاطب ہوا۔ ”نورل! ہمارا یار بہت دکھی ہے۔ ہم پر خدا کی لعنت ہو اگر ہم اپنے دوست کی مدد نہ کریں۔ کیوں بھئی؟“

نورل نے فوراً اثبات میں سر ہلاتے ہوے کہا، ”ہاں ہاں! جو یار کی مدد نہ کرے اس پرلعنت ہو بےشمار۔“

حیدری نے بات آگے بڑھائی۔ ”مگر نورل، ایک مسئلہ ہے۔ ہمارے یار کی معشوق ذات کی جوگی ہے اور رہتی بھی تمھارے گوٹھ میں ہے۔“

”اچھا؟ وہ میرے گوٹھ میں رہتی ہے؟ پھر نذیر یار، تجھے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے بس اس کا نام بتاؤ۔“

”یہی تو مسئلہ ہے۔ میں اس کا نام نہیں جانتا۔“ نذیر اسے پڈعیدن سے ٹھری میرواہ تک کے اپنے سفر کی روداد سنانے لگا۔ روداد مکمل ہونے پراس نے نورل سے پوچھا، ”اب تم ہی بتا سکتے ہو، اس پردہ نشین کا نام کیا ہے؟“

اس کی بات ختم ہوتے ہی نورل نشے کی جھونجھ میں سر ہلاتے ہوے بولا، ”ہاں۔ میں سب سمجھ گیا۔ وہ...وہ میرے گوٹھ کے معمولی وڈیرے اور ٹیلی فون آپریٹر موسیٰ جوگی کی زال ہے اور اس کا نام شمیم ہے۔ اسے وہ پیار سے چھمی کہہ کر بلاتا ہے۔“

”تم کس طرح اس سے نذیر کے بارے میں بات کرو گے؟“ حیدری نے اسے کریدا۔ نورل نے فوراً اس کے جواب میں کہا، ”وہ میری ماموں زاد بہن ہے اور میرا اس کے گھر آناجانا ہے۔ ویسے آپس کی بات ہے، وہ اپنے شوہر سے خوش نہیں ہے۔“

”وہ کیوں؟“ نذیر نے بےچینی سے دریافت کیا۔

نورل اس تفصیل بتانے لگا۔ ”موسیٰ جوگی اسے گھر کا خرچہ نہیں دیتا کیونکہ وہ چوٹی کا رنڈی باز اور جواری ہے۔ وہ آئے دن اس کی پٹائی کرتا رہتا ہے۔“

”کیا تم اپنی بیوی کے ذریعے اس سے میرے بارے میں بات نہیں کر سکتے؟“ نذیر نے جھجکتے ہوے اس سے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

نورل نے یہ سن کر کچھ دیر کے لیے چپ سادھ لی۔ چند لمحوں بعد وہ کہنے لگا، ”کچھ دن پہلے میری بیوی نے مجھے بتایا تھا کہ موسیٰ جوگی کی بیوی پڈعیدن سے آتے ہوے راستے میں کسی کو دیکھ دیکھ کر ہنستی رہی تھی۔ “

”تم اس کے ذریعے میرے یار کی بات چلاؤ،“ حیدری نے کرسی کے نیچے سے بوتل نکالتے ہوے کہا۔

نورل بوتل کے سحر میں مبتلا، سر ہلاتے ہوے بولا، ”جو سنگت کی صلاح۔“

انھیں شراب پینے کی عادت نہیں تھی، اس لیے انھیں اس کے نشے کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کو یقین دلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ انھیں نشہ نہیں چڑھا ہے، جبکہ باتیں کرتے ہوے ان کے لہجے بگڑ گئے تھے اور لفظوں کے تلفظ تک بالکل غلط ہو گئے تھے۔ وہ گفتگو میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے ہڑبونگ مچا رہے تھے۔

ان کے بلندآہنگ لہجے سن کر گلی سے گزرتے ہوئے راہگیر ٹھٹک کر دکان کے سامنے رک گئے اور شور مچانے کا سبب پوچھنے لگے۔ انھیں یہ ہوش نہیں رہا تھا کہ وہ مرکزی سڑک سے متصل گلی میں حیدری کی دکان پر بیٹھے تھے۔ کسی واقف کار یا رشتے دار کی آمد اِن کی شراب نوشی کو تمام قصبے کے باسیوں کے لیے گفتگو کا دلچسپ موضوع بنا سکتی تھی... اور پھر بات صرف گفتگو تک ہی محدود نہ رہتی۔

نذیر اور حیدری کو خدشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو پکوڑافروش موالی اپنے گھر پہنچ کر اپنی بیوی سے اس ضمن میں بات کرنا بھول جائے۔ وہ اسے یہ بات یاد رکھنے لیے اپنی دوستی کے ساتھ ساتھ مولا مشکل کشا اور شاہ نورانی کے واسطے دیتے رہے جبکہ پکوڑافروش باربار سر ہلا کر انھیں یقین دلاتا رہا کہ وہ نشے میں نہیں ہے اور وہ گھر پہنچ کر اپنی گھروالی سے ضرور بات کرے گا۔ وہ انھیں یہ یقین بھی دلاتا رہا کہ اب اس کی ان دونوں سے پکی دوستی ہے اور وہ ان کے لیے اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہے۔ اس بات پر نذیر نے اٹھ کر اس کا ماتھا چوم لیا اور ساتھ ہی اس سے یہ وعدہ بھی کر لیا کہ ٹیلی فون آپریٹر کی بیوی سے اس کا تعلق قائم ہو جانے پر وہ اسے گھوڑا مارکہ بوسکی کا کپڑا خرید کر اور اس کا جوڑا اپنے ہاتھوں سے سی کر اسے دے گا۔ اس پیشکش پر نورل نے اسے ایک فوجی کی طرح کھڑے ہو کر سلیوٹ کیا اور اپنا قدم آگے بڑھایا۔ وہاں پڑی ہوئی تمباکو کی بوری اسے دکھائی نہیں دی اور وہ اس پر سے ڈگمگا کر نیچے گر گیا۔ کھلی ہوئی بوری سے نکل کر تمباکو فرش پر پھیل گیا۔ حیدری یک دم اٹھا اور فرش پر گرا ہوا تمباکو بوری میں بھرنے لگا۔

پکوڑافروش موقع تاک کر حیدری کی کرسی پر براجمان ہو گیا۔ اپنی اس کارگزاری پر وہ کھیسیں نکالنے لگا۔ حیدری اسے کرسی پر بیٹھا دیکھ کر بہت جزبز ہوا۔ اس نے اسے الف ننگی گالیاں دیں جنھیں سنتے ہوئے پکوڑافروش ہنس ہنس کر محظوظ ہوتا رہا۔ حیدری نے کلائی پر بندھی گھڑی کو آنکھوں کے نزدیک لے جا کر اس پر وقت دیکھا تو دس بجنے والے تھے۔ وہ سٹپٹایا، کیونکہ اسے گھر پہنچ کر والد کے طمانچوں کا خیال آنے لگا تھا۔ وہ سہم گیا کہ اگر والد کو اس کی شراب نوشی کا پتا چل گیا تو وہ اسے کھڑے کھڑے گھر سے نکال دے گا۔ اسے معلوم تھا کہ اگلے دن تک اس کے منھ سے شراب کی بو نہیں جائے گی۔

دکان کے دروازے پر کسی قوی الجثہ شخص کا سایہ دیکھ کر حیدری خوف سے کانپ کر رہ گیا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور زبان سے ایک لفظ تک نہیں نکلا۔ نذیر اور پکوڑافروش بھی مبہوت ہو کر اسے تکنے لگے اور اندازہ لگانے لگے کہ یہ کوئی بشر ہے یا جن بھوت۔ اس طویل قامت ہیولے جیسے شخص نے اپنے چہرے کو ڈھاٹا باندھ کر چھپایا ہوا تھا۔ اس کے پورے جسم پر چادر پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ میں لکڑی کا بڑا سا ڈنڈا تھام رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں ٹارچ پکڑی ہوئی تھی۔ اس نے ٹارچ سے باری باری ان تینوں کے چہروں پر روشنی ڈالی۔

نذیر اور حیدری کے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ انھوں نے دکان پر کھڑے طویل قامت شخص کو واقعی کوئی ماورائی ہستی تصور کر لیا تھا، مگر نورل جوگی مسلسل اسے دیکھتے رہنے کی وجہ سے پہچان گیا کہ وہ ٹھری میرواہ کے بازار کا پرانا چوکیدار ہے۔ اس کے ہونٹوں سے بےساختہ نکلا: ’’ارے لاہوتی سلیمان شر، یہ تم ہو کیا؟ کیا تمھارے نازل ہونے کا وقت ہو گیا؟ آدھی رات گزر گئی ہے کیا؟‘‘

یہ سن کرجناتی قدکاٹھ والے سلیمان شر نے قہقہہ لگایا۔ ’’ارے نورل! پکوڑے بیچنے والے، اس وقت تیرا یہاں کیا کام؟‘‘

چوکیدار کو پہچانتے ہی حیدری پر ہنسی کا دورہ پڑگیا۔ ’’ارے سلیمان شر! تو نے تو ہماری روح فنا کر ڈالی۔‘‘

چوکیدار مسکراتا ہوا دکان کے اندر داخل ہوا۔ وہ سامنے زمین پر پڑے ہوئے گلاسوں، جگ اور بوتل کو دیکھ کر فوراً معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔

وہ افسوس سے اپنے سر کو جنبش دیتا دونوں لڑکوں سے مخاطب ہوا۔ ’’تم دونوں کیوں حرام چیز اپنے منھ سے لگا کر اپنے بزرگوں کی عزت خراب کر رہے ہو؟ تم دونوں کو شرم آنی چاہیے۔‘‘ انھیں ڈانٹنے کے بعد وہ نورل جوگی پر برسنے لگا۔ شاید اسے پکوڑافروش سے کوئی پرانی پرخاش تھی۔ وہ اسے تھانے میں بند کروانے کی دھمکیاں دینے لگا۔ پکوڑافروش زیرلب مسکراتے ہوئے اس کی ڈانٹ سنتا رہا۔ وہ چوکیدار کے ہنگامہ خیز مزاج سے بخوبی آشنا تھا۔ دھمکیاں دیتے دیتے اس نے نورل کو بازو سے پکڑ کر کرسی سے اٹھایا جیسے وہ اسے اسی وقت تھانے لے جانا چاہتا ہو۔ یہ دیکھ کر حیدری اور نذیر اس کی مدد کے لیے لپکے اور چوکیدار کو برابھلا کہنے لگے۔ نورل کا ایک ہاتھ تو اس کی گرفت میں تھا مگر اس نے اپنے دوسرے ہاتھ کو استعمال کرتے ہوئے اپنی جیب سے تھوڑی سی چرس نکال ہی لی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر وہ چوکیدار کو دکھائی تو اس نے فوراً اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ نورل کی ہوشیاری پر نذیر مسکرانے لگا۔

چوکیدار نے نورل سے چرس لینے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا تو اس نے فوراً چرس جیب میں ڈال لی اور اسے تنگ کرنے لگا۔ اب اسے کھری کھری سنانے کی نورل کی باری تھی۔ اس نے سلیمان شر کی تمام گالیاں اسے سود سمیت واپس کر دیں۔ سلیمان شر نے زبان نہیں کھولی اور چپ چاپ سنتا رہا۔

نذیر اور حیدری نے اس معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی مگر ان دونوں کا رویہ سمجھ نہیں آ سکا۔ کچھ دیر بعد حیدری نے اپنی دکان بند کرنے کا اعلان کیا تو وہ سب جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوے۔

نورل نے اپنے گھر پر حقہ پینے کے لیے حیدری سے تمباکو مانگا تو اس نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر بہت سا تمباکو اسے دے دیا۔

دکان کو تالا لگانے کے بعد حیدری ان سے ہاتھ ملا کر اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ چوکیدار سلیمان شر سیٹی بجاتا سڑک کے دوسری جانب چل پڑا جبکہ نذیر اور نورل نہر کے پل کی سمت چلے گئے۔

کھلی سڑک پر نذیر کو ٹھنڈ لگنے لگی۔ نہر کے پُل پر پہنچ کراس نے پکوڑافروش کو ایک مرتبہ پھر وعدہ یاد دلاتے ہوے مصافحہ کیا اور ڈگمگاتے ہوے قدموں سے ڈاک بنگلے کی طرف چل پڑا۔

نذیر سے الگ ہو کر پل سے نیچے اترتے ہی نورل کا دھیان ایک ست رنگے لیکن مست خیال کے زیرِاثر آ گیا۔ وہ لڑکھڑا کر چلتے ہوے دھیرے دھیرے اپنے گوٹھ کی طرف بڑھنے لگا۔ گھر پہنچ کراس نے بھوک سے بلبلاتے ہوے اپنے معدے کے بارے میں نہیں بلکہ صرف اپنی رگوں میں سرسراتے ہوے نشے کے بارے میں سوچا جس کی وجہ سے آج اسے مباشرت بھری ایک طویل رات میسر آنے والی تھی۔ اس نے جی ہی جی میں نذیر کی مہمان نوازی کو سراہا جس کی بدولت اس نے شیر نامی شراب کا ذائقہ پہلی بار چکّھا تھا۔ گوٹھ کی حدود میں داخل ہوتے ہی آوارہ کتوں کا ایک غول اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکا، مگراس کے قریب آ کراس کے بدن کی مانوس بو محسوس کرنے کے بعد وہ سب اس کے پاؤں میں لوٹنے لگے۔ وہ اپنے گھر میں داخل ہوا تو یہاں تاریکی اور سکوت نے اس کا خیرمقدم کیا۔ وہ ڈگمگاتے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازے کو دھکیل کر کھولتے ہوے اندر داخل ہو کر وہ ٹھہر گیا اور اندھیرے میں آنکھیں مچمچا کر دیکھتے ہوے وہ اپنی گھروالی کی چارپائی ڈھونڈنے لگا۔ اس کی چارپائی نظر آتے ہی وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے قریب پہنچ کر اس نے جھک کر ہولے سے اپنی بیوی کے پیروں کو چھوا تواس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ خوف سے چیخنے ہی لگی تھی کہ نورل کے ہنسنے کی آواز سن کروہ سمجھ گئی کہ اس کا شوہر گھر واپس آ گیا ہے۔ وہ خفگی سے بڑبڑانے لگی۔ نورل اس کے پہلو میں لیٹ گیا اور اس نے اس کے بڑبڑاتے ہونٹوں پر اپنے جلتے ہوے ہونٹ رکھ کر اسے خاموش ہونے پر مجبور کر دیا۔ ایسے میں نذیر کا خیال اس کے ذہن کے مخفی ترین گوشے میں جا کر چھپ گیا۔

اگلے دن پکوڑافروش کی بیوی نوراں سویرے ہی اٹھ گئی۔ اس نے اٹھ کراپنے سر پر ڈوپٹہ باندھتے ہوے خود کو بیمار محسوس کیا۔ آج اس نے دو سیر دودھ خریدا اور اپنے بچوں کو نورل سے چغلی نہ کھانے کی نصیحت کرنے کے بعد وہ اس میں سے ایک سیر دودھ غٹاغٹ پی گئی۔ دودھ پینے کے بعد کل شب کی صحبت سے زائل ہونے والی توانائی کو اس نے قدرے بحال ہوتے محسوس کیا، مگر نجانے کیوں چائے کی دو پیالیاں پیتے ہی اس کا دل ڈوبنے لگا۔ لیکن وہ مضبوط کاٹھی کی عورت تھی، اس لیے دل کے ڈوبنے کو خاطر میں نہیں لائی اور جھاڑو اٹھا کر گھر کی صفائی میں مصروف ہو گئی۔ وہ اس بات سے بےخبر تھی کہ کل رات نورل نے اس کی جو درگت بنائی تھی اس کا ذمےدار پڈعیدن کے ریلوے اسٹیشن پر ملنے والا وہ چھوکرا تھا جس نے اسے اور اس کی ساتھی کو چائے پلائی تھی۔

اس نے جان بوجھ کر نورل کو نیند سے جلدی نہیں جگایا۔ وہ اس کی نیند خراب نہ کر کے اس کی کل رات کی محبت کا قرض چکانا چاہتی تھی۔ کام کاج سے فارغ ہو کر وہ کمرے میں گئی تو چند لمحے اس کی چارپائی کے پاس کھڑی اسے تکتی رہی۔

نورل کی ٹانگ اور چہرہ لحاف سے باہر نکلے ہوے تھے۔ اس کی بےترتیب مونچھوں اور بکھرے ہوے بالوں کو دیکھ کر نوراں مسکرائی۔ مگر پھر یکایک نجانے کیوں اسے اپنے شوہر پر غصہ آنے لگا۔ وہ پکوڑوں سے بھرا ہوا تھال اندر لے گئی اور اسے اچھی طرح ڈھانپ کر زمین پر رکھ دیا۔ پھر کمرے میں واپس آ کر اس نے نورل کی رضائی کو اُتار کر پھینک دیا۔ وہ آنکھیں مسلتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اس نے صحن میں پھیلی ہوئی دھوپ دیکھی تو دیر سے جگانے پر اپنی بیوی کو ملامت کرنے لگا۔ اس کے بعد وہ کھیتوں کی طرف چلا گیا۔

گنے کے کھیت میں رفعِ حاجت کے بعد وہ اپنے وڈیرے کی اوطاق میں لگے ہوے نلکے پر غسل کر کے گھر واپس آیا۔ نوراں نے اسے چائے کی پیالی لا کر تھمائی۔ سڑکیاں لگا کر چائے پیتے ہوے اسے نذیر کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اس نے فوراً آواز دے

کر نوراں کو بلایا۔

نوراں اسے شک بھری نظر سے دیکھتی کھاٹ پر اس کے برابر بیٹھ گئی۔ نورل چائے کا گھونٹ لینے کے بعد اس سے مخاطب ہوا۔ ”تیری ساس مرے، ایک بات غور سے سن۔ مگر بات سننے سے پہلے مجھ سے وعدہ کر کہ میں تجھ سے جیسے کہوں گا، تو ہوبہو ویسے ہی کرے گی۔“

اپنے شوہر کی مضحکہ خیز سنجیدگی پر اسے ہنسی آنے لگی مگر وہ اپنی ہنسی کو بمشکل ضبط کرتے ہوے سر ہلا کر بولی، ”اچھا اچھا، وعدہ کرتی ہوں۔“

نورل اپنا مدعا بیان کرنے سے پہلے اسے کچھ دیر کے لیے چمکدار خوابوں کی دنیا میں لے گیا۔ اس نے رنگین چوٹیوں، مرزا کمپنی کی مضبوط چپل، پھول دار ملبوسات اور لیس والے ریشمی ڈوپٹوں کا ذکر کچھ ایسے پرکشش انداز سے کیا کہ ان سب چیزوں کے لیے ترسی ہوئی نوراں خود کو تھوڑی دیر کے لیے وڈیرے ہاشم جوگی کی بہو خیال کرنے لگی۔ اس دوران وہ اپنے بےرنگ ڈوپٹے میں اپنے سفید اور کالے بال چھپاتی ہوے نورل کی باتوں میں کھوئی رہی۔

اپنی کامیابی پر زیرِلب مسکراتے ہوے نورل نے اس کے پڈعیدن جانے کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس سفر کے بارے میں سنتے ہی نوراں نے اپنے شوہر کو صاف صاف بتا دیا کہ اس لڑکے نے بڑے پُل تک ان کا پیچھا کیا تھا اور شمیم ابھی تک اسے بھول نہیں سکی تھی، اور اکثر اس ذکر کسی نہ کسی بہانے سے کرتی رہتی تھی۔

پکوڑافروش نے اپنی بیوی کو یہ بتا کر حیران کر دیا کہ وہ اس لڑکے کو اچھی طرح جانتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اصل مقصد کی طرف آیا اور کہنے لگا، ”وہ لڑکا اب میرا اچھادوست ہے اور میں اسے زبان دے چکا ہوں۔ سمجھتی ہو نا؟ وہ بیچارہ اس کی محبت میں چرس پینے لگا ہے۔ مگر وہ سگریٹ بھی نہیں پیتا تھا پہلے۔“

نذیر کی حالتِ زار کا سن کرنوراں کا دل پسیجنے لگا اور وہ اس سے ہمدردی محسوس کرتے ہوے آہ بھر کر بولی، ”وے چارو!“

پکوڑافروش نذیر کا حال بڑھاچڑھا کر بیان کرتا رہا اور ساتھ ہی اپنے فائدے کی بات بھی کرتا رہا، جس کا اس کی بیوی پر بہت اثر ہوا اور اس نے تباہ حال نوجوان کی مدد کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

پکوڑوں سے بھرا ہوا تھال اٹھاتے ہوے اس نے اپنی بیوی کو آخری نصیحت کی۔ ”اور یہ بات اچھی طرح سن لو! شمیم کو میرے بارے میں نہ بتانا۔ اسے کہنا کہ وہ لڑکا تمھیں بازار میں اچانک ملا تھا اور تمھارے قدموں میں آ کر گر پڑا تھا۔ اگر تم نے اس کے سامنے میرا نام لے لیا تو وہ اس سے ملنے پر رضامند نہیں ہو گی۔ سمجھ گئیں نا؟“

نوراں یہ سن کر ذرا سی پریشان تو ہوئی مگر پھر کہنے لگی، ”ایسے معاملے میں اگر کوئی مرد درمیان میں آ جائے تو عورت فوراً بدک جاتی ہے۔“

پکوڑافروش اپنی بیوی کی ذہانت پر اس کی تعریف کرنے لگا اور تھال سر پر رکھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

نورل نے گاؤں کی شریف اور معتبر عورت کے دل میں نذیر کے لیے موجود محبت کو کچھ دنوں تک اس سے چھپائے رکھا۔ وہ ایک طرف اپنے دوست کے جذبوں کی شدت کا اندازہ لگانا چاہتا تھا مگر دوسری طرف وہ اپنے گوٹھ کی عورت کی رسوائی سے بھی خوفزدہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ذرا سی بےاحتیاطی سے یہ معاملہ قصبے اور گردوپیش کے دیہات کے لوگوں کی اجتماعی یادداشت کا حصہ بن سکتا تھا اور اس عورت کے لیے ہمیشہ کی رسوائی اور ذلت کا باعث بھی بن سکتا تھا۔ اس نے نذیر کو بھی اس معاملے میں رازداری برتنے کی تنبیہ کی اور اسے اس کی محبت کے ہر ممکنہ انجام کے متعلق بھی آگاہ کیا۔

نورل نے اپنی باتوں سے اپنے دوست کے دل میں مایوسی کو گھر بنانے نہیں دیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ہر نوجوان عاشق کا دل قنوطی ہونے کے باوجود کبھی بھی بےآس نہیں ہوتا — وہ ہمیشہ کسی نہ کسی معجزے کی رونمائی کا منتظر رہتا ہے۔

نذیر جو ہر وقت اسے کریدتا رہتا تھا اور اس کی باتوں کی ٹوہ لیتا رہتا تھا، تو وہ یہ بےسبب نہیں کرتا تھا — وہ پوری سنجیدگی اور انہماک سے پردہ نشین خاتون سے تعلق استوار کرنا چاہتا تھا۔

نذیر نے ان معاملات کو غفور چاچا اور یعقوب کاریگر سے چھپایا ہوا تھا۔ اب وہ دن کا بیشتر وقت دکان پر گزارتا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد چاچا غفور قیلولہ کرنے کی غرض سے چند گھنٹوں کے لیے گھر چلا جاتا تھا۔ نذیر اور کاریگر سہ پہر تک جمائیاں لیتے کام کرتے رہتے اور شام کو چاچے کی آمد سے پہلے تک چاق و چوبند ہو جاتے۔

نذیر کو شام سے پہلے ہی دکان سے چھٹی مل جاتی۔ اس کے بعد وہ رات نو بجے تک حیدری کے ساتھ قصبے میں آوارہ گردی کرتا رہتا۔

اس نے پچھلے کچھ عرصے کے دوران جیب خرچ بچا بچا کر جتنی بھی رقم جمع کی تھی وہ نورل سے ملاقاتوں میں اس کے بہت کام آئی تھی۔ کپڑوں کی خریداری کے بعد وہ پریشان ہو گیا، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اظہارِمحبت کے بعد بھی اسے روپوں کی ضرورت پیش آئے گی۔ لوگوں سے محبت کی کہانیاں سن سن کر اس نے یہ اصول اخذ کیا تھا کہ دولت کے بغیر کسی محبوبہ کا دل جیتنا ممکن ہی نہیں تھا۔

دو دن کے لیے جب پکوڑافروش قصبے کی طرف نہیں آیا تو نذیر اسے ڈھونڈتا دیر تک گلیوں میں گھومتا رہا۔ اس کے تمام ممکنہ ٹھکانوں پر جا کر اسے مایوسی ہوئی۔ وہ تھک ہار کر نہر کے کنارے چائے خانے پر جا بیٹھا اور گردوپیش نظر دوڑانے لگا۔ آسمان گہرا نیلا تھا، اس کے کناروں پر بہت دور کہیں کہیں سفید بادل اپنا سر نکالے نظر آ رہے تھے۔ سورج کی کمھلائی پیلی دھوپ نہر کے پانی اور کھیتوں پر دور دور تک پھیلی تھی۔ نہر کے پُل پر اکادکا سائیکلوں اور چھکڑوں کی آمدورفت جاری تھی۔

نذیر سوچتا رہا کہ جتنے روز نورل سے ملاقات ہوتی رہی، اُس کے طفیل وہ بلاسبب برقع پوش کی قربت کو محسوس کرتا رہا۔

اسے وہاں بیٹھے بیٹھے بہت دیر گزر گئی۔ دھیرے دھیرے شام ڈھلنے لگی تو آسمان اچانک پرندوں کی آوازوں سے بھر گیا۔

ہولے ہولے تاریکی پھیلنے لگی تو نذیرمایوس ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور نہر کے کنارے چلنے لگا۔ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ وہ بہت بےقراری محسوس کر رہا تھا۔ بار بار اسے یہ خیال تنگ کر رہا تھا کہ اس نے بلاضرورت بیکار کی پریشانی مول لے لی تھی۔

نہر کے آس پاس سب ٹھیلے والے جا چکے تھے۔ پل کی دیوار پر ایک بوڑھا آدمی بیٹھا کھانس رہا تھا۔ نذیر پرانے اور خستہ سے پُل پر چلتا ہوا دوسری طرف پہنچا اور گوٹھ ہاشم جوگی سے اٹھنے والے دھویں کی بو سونگھنے لگا۔ گاؤں سے آنے والے کچے راستے پر اس نے ایک شخص کو لحاف اوڑھ کر پل کی طرف آتے ہوے دیکھا۔

آہستہ آہستہ دھندلائے منظر بھی اندھیرے میں معدوم ہونے لگے مگر نذیر وہیں کھڑا رہا۔ پل پر بیٹھا ہوا بوڑھا آدمی بھی جا چکا تھا۔ وہ دن بھر خاموشی سے بہنے والے پانی کی مدھم مدھم سی سرگوشیاں سننے لگا۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا — اس پر ہنس رہا تھا، یا شاید رو رہا تھا۔ تاریکی میں ٹھنڈے سانس بھرتے ہوے وہ پُل کی دیوار پر جا بیٹھا۔

اچانک کسی نے کھڑکھڑاتے ہوے لہجے میں اس کا نام پکارا تو اس نے فوراً چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ نورل جوگی تھا۔ سرد ہواسے بچنے کی خاطر اس نے سر سے پیر تک لحاف اوڑھا ہوا تھا۔

نذیر سے مصافحہ کرتے ہوے اس نے قہقہہ لگایا جو اگلے ہی لمحے شدید کھانسی میں تبدیل ہو گیا۔ کھانستے ہوے اس کا جسم جھک گیا۔ چند لمحوں بعد کہیں جا کر اس کی کھانسی تھمی۔

نذیر پکوڑافروش سے کوئی بات سننا چاہتا تھا۔ اس نے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ اسے معلوم تھا کہ پکوڑافروش موالی طوطے کی طرح خودبخود بولنا شروع کر دے گا۔ وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی پیٹھ تھپتھپانے لگا۔

سگریٹ سلگا کر نورل اسے اپنی بیماری کے متعلق بتانے لگا۔ وہ اپنے گاؤں کی اوطاق میں چرس اور بھنگ پیتا رہا تھا۔ وہیں پر اسے ٹھنڈ لگ گئی۔ اس نے بتایا کہ اگر اسے آج چرس نہ خریدنا ہوتی تو آج بھی قصبے کی طرف نہ آتا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے ہنستے ہوئے نذیر کو بتایا: ”بوہتار، تیرے لیے ایک خاص خبر ہے، اور ایک خاص پیغام بھی۔“

اس کی بات سن کر نذیر خود کو مسکرانے سے نہیں روک سکا۔

نورل نے اگلے ہی لمحے کسی تردّد کے بغیر اسے بتا دیا کہ اس نے پڈعیدن اسٹیشن پر شمیم کو جو چائے پلائی تھی، وہ اس چائے کی پیالی کو ابھی تک نہیں بھولی تھی۔ وہ نذیر سے ملنا چاہ رہی تھی۔

یہ سنتے ہی نذیر خوشی سے بےقابو ہو کر پکوڑافروش سے لپٹ گیا۔

نذیر کی زندگی میں شمیم پہلی عورت تھی جس نے اس سے ملنے کے لیے اسے پیغام بھیجا تھا، ورنہ اس سے پہلے بھی وہ بےشمار لڑکیوں اور عورتوں کا تعاقب کر چکا تھا مگر ان میں سے کسی کی جانب سے پیغام آنا تو درکنار، اسے ان کو دیکھنے کا دوسرا موقع تک میسر نہیں آ سکا تھا۔ وہ سب کی سب اپنے گھروں میں جانے کے بعد اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھول گئی تھیں۔ پکوڑافروش کے ذریعے موصول ہونے والے پیغام کی اس کے لیے بہت خاص اہمیت تھی۔ اسی لیے اس کا اپنا بیکار وجود بھی اس کی اپنی نظروں میں یکایک کچھ اہم ہو گیا تھا۔ باربار کسی سبب کے بغیر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جاتی تھی۔ آج اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ انسانوں سے بھری ہوئی اس دنیا میں ایک عورت ایسی بھی ہے جو اس کے بارے میں سوچتی ہے۔ اس کے لیے یہ خیال بہت مسحورکن تھا۔ مگر اس سے بھی زیادہ مسحورکن خیال آج کی شب پیش آنے والے وصل کی لذت کا خیال تھا، جس کا ہلکا سا احساس ہی اس کے بدن پر سرشاری طاری کر رہا تھا۔

اسی خیال کے زیرِاثر وہ بہت دیر تک متواتر سلائی مشین چلاتا رہا۔ اسے وقت کے تیزی سے گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ بہت دیر کے بعد اس نے اپنا ہاتھ روکا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ اس کی نظر یعقوب کاریگر کے چہرے پر جا کر ٹھہر گئی جو ایک ریشمی لباس کی سلائی میں مصروف تھا۔ اس کی آنکھیں سلائی مشین کی ٹانکے لگاتی باریک سوئی کو شوق بھری نظر سے دیکھ رہی تھیں۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں ریشمی کپڑے کو کچھ اس طرح جھجکتے ہوئے چھو رہی تھیں جیسے وہ کسی عورت کے جسم کو اس کی اجازت کے بغیر اور اس سے چھپ کر چھو رہی ہوں۔

نذیر نے حیرت سے سوچا کہ نسوانی کپڑوں کی سلائی کے دوران یعقوب کاریگر اپنے گردوپیش سے اتنا لاتعلق ہو جاتا تھا کہ اسے بیڑی پینے کا ہوش بھی نہیں رہتا تھا۔ عجیب لذت سے تمتماتا ہوا اس کا چہرہ دیکھ کر نذیر کو اس کے ہاتھوں کے ہنر کی مقبولیت کا راز معلوم ہو گیا۔

ابھی شام ڈھلنے میں خاصا وقت تھا اور آدھی رات ہونے میں تو اس سے بھی زیادہ وقت باقی تھا۔ یکایک وہ محسوس کرنے لگا کہ ہیجان خیز محسوسات و خیالات کی یورش کی وجہ سے دھیرے دھیرے اس کے جذبات کند ہونے لگے ہیں، اور وہ اپنے آپ کو فاترالعقل سمجھنے لگا۔ اپنا ذہن ہٹانے کا سوچ کر اس نے دیوار پر چسپاں تصویروں پر ایک نگاہ ڈالی۔ فلمی اداکاراؤں کے میک اپ سے بھرے چہرے اس کی نگاہوں سے خودبخود اوجھل ہو گئے۔ اسے صرف کسے کسائے ملبوسات میں پھنسے ہوئے بدن دکھائی دیے۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ دکان کی چھت سے فرش تک صرف نسوانی اعضا کی تصویریں لگی ہوئی ہیں اور ہر نسوانی عضو ہر قسم کی نزاکت اور حسن سے یکسر عاری ہے اور اس میں سے صرف شہوانیت کا اظہار ہو رہا ہے۔ وہ کچھ دیر تک بھرے بھرے جسموں کی گداز چھاتیوں اور ابھرے ہوئے پیٹ کی ناف کو دیکھتا رہا۔ اس عمل سے اچانک اس کا خون گرم ہو گیا اور ناک کے نتھنوں سے گرم گرم سانسیں نکلنے لگیں۔

یعقوب کاریگر اسے محویت سے تصویروں کو تاکتے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اسے مسکراتا دیکھ کر نذیر کھسیانا ہو کر اٹھا اور دکان سے باہر چلا گیا۔ گلی سے نکل کر وہ سڑک پر آیا اور یہاں کی کھلی فضا میں لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے اپنی طبیعت بحال کرنے لگا۔

سڑک کے پرلی طرف کپڑے کی ایک دکان پر لٹکی ہوئی پھول دار چادریں اور ڈوپٹے ہوا کے جھونکوں سے ہل رہے تھے۔ ایک دکانداراپنی پردہ نشین گاہک کے سامنے ریشمی کپڑے کا تھان کھول رہا تھا۔ نذیر اس برقع پوش عورت کی طرف دیکھنے لگا۔ دکان پر پڑتی سورج کی تیز روشنی کے سبب اس کے برقعے میں عجیب سی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ اسے لگا کہ وہ یہاں کھڑا ہو کر زیادہ دیر تک اس برقعے کی چمک کو اپنی آنکھوں میں جذب نہیں کر سکتا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دکان پر لوٹ آیا۔ یعقوب کاریگر اسے دیکھتے ہی بولا، ”آج میں دکان پر بہت اکیلائی محسوس کر رہا ہوں۔ آج میرے یار کی طبیعت خراب ہے، اس لیے وہ نہیں آیا۔ اور تم ہو کہ مجھ بوڑھے سے کوئی بات ہی نہیں کرتے۔“ وہ ایک بیڑی سلگا کر کش لینے لگا۔

نذیر اس کے قریب رکھے ہوئے اسٹول پر جا کر بیٹھ گیا اور وہ دونوں چاچے غفور کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ زیادہ تر باتیں پرانی تھیں جو وہ پہلے بھی کئی بار کر چکے تھے۔ نذیر کو کوئی نئی بات نہیں سوجھ رہی تھی اس لیے وہ خاموش ہو گیا، کیونکہ کاریگر باتیں کرنے کی موج میں آیا ہوا تھا۔ نذیر کو اچانک چاچی خیرالنسا یاد آئی۔ آج چاچا بھی گھر پر موجود تھا۔ اس نے اپنی چشم ِتصور سے کمرے میں ایک دوسرے کے ساتھ پیوست سایوں کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا۔

یعقوب کاریگر کی باتیں سنتے ہوئے اسے لگا کہ چاچے غفور سے اس کی دوستی کی ضرور کوئی خاص وجہ رہی ہو گی، جس کے بارے میں کاریگر نے بھول کر بھی باتوں میں کوئی اشارہ نہیں کیا تھا۔ نذیر نے سوچا کہ اگر کسی دن وہ کاریگر کو اعتماد میں لے کر اس سے پوچھ گچھ کرے تو شاید اسے کچھ گڑے مُردوں کا پتا چل جائے۔

دکان کے باہر ایک سائیکل کو رکتا دیکھ کر وہ دونوں چپ ہو گئے۔

ماسٹر طفیل اپنی دھوتی سنبھالتا ہوا سائیکل سے اتر کر دکان میں داخل ہوا۔

”میں تمھارا ہی کام کر رہا تھا ماسٹر۔ صرف قمیص کے بٹن لگانے رہ گئے ہیں،“ یعقوب نے خوش مزاجی سے اسے اس کے کپڑوں کے بارے میں بتایا۔ ماسٹر طفیل کچھ دیر بعد آنے کا کہہ کر چلا گیا۔

گلی میں دکانوں کے شٹر بند ہونے کی کھڑاک پڑاک شروع ہو گئی۔ تمام درزی ہنستے، شور مچاتے ہوئے اپنی اپنی دکانوں سے نکلے۔ تھوڑی دیر بعد اذان بھی سنائی دینے لگی۔

ماسٹر طفیل کو اس کے کپڑے دینے کے بعد انھوں نے بھی دکان بند کر دی اور یعقوب کاریگر چاچے غفور کی عیادت کے لیے اس کے ساتھ چل پڑا۔

ملگجی شام میں چاچی خیرالنسا کشادہ صحن میں جانماز پر سمٹی ہوئی بیٹھی نماز پڑھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ دعا مانگتے ہوئے لرز رہے تھے۔ نذیر کے قدموں کی چاپ سن کر اس نے مڑ کر دیکھا اور اس کے ہونٹ تیزی سے دعا ختم کرنے لیے ہلنے لگے۔

نذیر دو محرابوں کے درمیان کھڑا عبادت ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ صحن میں پھیلتی تاریکی کو دیکھ کر اس نے بلب روشن کرنے کی خاطر دیوار پر نصب کالا بٹن دبایا تو برآمدے میں روشنی پھیل گئی۔ اس نے تاریک کمرے پر نظر دوڑائی۔ غفور چاچا وہاں رضائی اوڑھ کر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے خراٹوں کی خرخراہٹ سن کر وہ مسکرایا۔

چاچی کو جانماز اٹھاتا دیکھ کر اس نے اس کے پاس جا کر یعقوب کاریگر کی آمد کے بارے میں بتایا۔ وہ فوراً اپنے شوہر کو جگانے کے لیے کمرے میں چلی گئی۔ چاچا غفور اپنے یار کا نام سن کر فوراً اُٹھ بیٹھا۔

چاچی خیرالنسا پردے کی خاطر باورچی خانے والی کوٹھڑی میں چلی گئی۔

یعقوب کاریگر کو دیکھ کر بوڑھا مریض خوشی سے کھل اُٹھا۔

نذیر اپنی گھڑی پر وقت دیکھ رہا تھا، کیونکہ پہلوان کے چائے خانے پر نورل جوگی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اسی بےچینی میں وہ باورچی خانے میں چاچی کے سامنے چوکی پر جا بیٹھا۔ چاچی خیرالنسا نے اپنے شوہر اور کاریگر کی پرانی دوستی کا ذکر چھیڑ دیا۔

باتوں کے دوران نذیر کو پہلے اس کے ہاتھ کا لمس یاد آیا اور پھر غسل خانے میں لٹکا ہوا اس کا بلاؤز۔ بیٹھے بیٹھے وہ چاچی کے سرخ و سفید ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔ اس نے سوچا کہ ان ہاتھوں میں پوشیدہ حدت کتنی نرم و ملائم ہو گی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اسی وقت انھیں چھو کر محسوس کرے اور ان کی ہتھیلیوں پر ایک بوسہ ثبت کردے۔ اس نے خود کو گستاخی پر آمادہ محسوس کیا۔ وہ اس کے کشادہ سینے کے زیروبم کو دیر تک محویت سے دیکھتا رہا۔

وہ حیران تھا کہ اس کی باتوں میں عدم دلچسپی کے باوجود وہ بےخبری کے عالم میں دیر تک باتیں کرتی رہی۔ جب وہ چولھے میں پھونک مارنے کے لیے جھکی تو نذیر نے چپ چاپ اس کی چھاتی کے ابھار کو دیکھا، مگر اگلے لمحے چاچی خیرالنسا اپنے سینے پر ہاتھ باندھ کر اسے شک بھری نظروں سے گھورنے لگی۔ اس کے گھورنے پر وہ جھینپ سا گیا۔ اسے الجھن ہونے لگی۔ وہ باتونی نہیں تھا مگر چاہتا تھا کہ پرکشش جسم والی اس حسین عورت سے دیر تک لچھےدار باتیں کر کے اس کا دل بہلائے۔

چاچی نے پتیلی اٹھا کر چینک میں چائے انڈیلی۔ وہ ٹرے میں رکھی چینک اور پیالیاں اٹھائے ہوے باورچی خانے سے باہر چلا گیا۔

کمرے میں ان کے سامنے چائے رکھنے کے بعد وہ آدھے گھنٹے تک ان دو بوڑھے آدمیوں کے ساتھ بیٹھا رہا۔ ان کی باتیں سنتے ہوے اس نے سوچا کہ غفور چاچا دلچسپ گفتگو کرنے کا ماہر تھا، اسی لیے اس نے ابھی تک چاچی کو اپنے قابو میں رکھا ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد یعقوب کاریگر نے چاچے سے جانے کی اجازت مانگی۔ وہ اسے رخصت کرنے گلی کے آخر تک چلا گیا۔ الوداعی مصافحے کے بعد وہ کچھ وقت وہیں کھڑا اسے جاتے ہوے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد وہ پہلوان کے چائے خانے کی طرف چل پڑا۔

چائے خانے میں نوجوان لڑکے ڈبّو کھیلتے ہوے شور مچا رہے تھے۔ وہاں ٹیپ ریکارڈر پر جلال چانڈیو کا گانا بج رہا تھا۔ ایک طرف پڑے ہوے موڑھوں پر دو چار آدمی بیٹھے دھیمے لہجوں میں گفتگو کر رہے تھے، جبکہ نورل منہ بسورتا ہوا اکیلا بیٹھا تھا۔

نذیر پکوڑافروش پاس گیا تو وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔ انھوں نے موڑھے اٹھا کر ایک کونے میں کھسکا لیے اور آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔

پکوڑافرو ش نے رازداری سے اسے بتایا کہ آج رات ایک بجے وہ اپنے گھر کے پچھلے دروازے سے نکل کر پانی کے نالے کے پاس اس کا انتظار کرے گا۔ اس پر لازم تھا کہ وہ ایک بجے سے پہلے وہاں پہنچ جائے۔ اس نے اسے مزید یقین دلایا کہ ملاقات کے دوران وہ دونوں عاشقوں کے آس پاس منڈلا تا رہے گا۔

نذیر نے اس کی ہر بات غور سے سنی۔ اس نے اپنے ذہن میں پہلی ملاقات کا جو تصور باندھا تھا، اس پر خوف کی پرچھائیں لہرانے لگی۔ اس کے باوجود چائے خانے سے اٹھ کر جاتے ہوے نذیر نے وعدہ کیا کہ وہ ساڑھے بارہ بجے تک نہر سے اُترنے والی سڑک پر پہنچ جائے گا۔

نورل نے بھی سنجیدگی سے اپنا وعدہ دُہرایا اور وہاں سے چلا گیا۔

کل وہ اپنے بستر پر جس شب کے انتظار میں لیٹا ہوا کروٹیں لے رہا تھا، وہ شب آ پہنچی تھی اور اپنے بازو پھیلا کر اسے دعوتِ نشاط دے رہی تھی۔ مگر یہ کیا؟ گزرتے ہوے لمحوں کے ساتھ نہر پار جانے کے خیال سے اس کے دل میں دہشت بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ خود کو کسی طور پر ڈرپوک ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے بزدلی کو واہمہ قرار دے دیا اور اس کے خیال کو جھٹکنے کے لیے وہ چاچے غفور کے ساتھ اس وقت کمرے میں بند چاچی خیرالنسا کے بارے میں سوچنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر اس کا ذہن اس پل چاچی کے متعلق کچھ بھی سوچنے کے لیے آمادہ نہیں ہوا۔ اسے کوئی بات نہیں سوجھی، اس کے دل میں کوئی احساس پیدا نہیں ہوا، حتیٰ کہ چاچی کے گداز سینے کا خیال بھی اس کے ذہن کو اپنی طرف مائل نہ کر سکا۔ اور دوسری طرف کسی کوشش کے بغیر اس کا ذہن باربار خودبخود شمیم کے بارے میں سوچنے لگتا تھا۔ اگرچہ اس نے اب تک اس برقع پوش شمیم کی آواز نہیں سنی تھی، اس کے ہونٹ اور اس کے سینے کا شاہد نہیں ہوا تھا، اس کے باوجود فوراً اس کے ذہن میں درازقد اور بھرپور جسم کی ایک شاندار عورت در آئی تھی۔ وہ اس کے سحرانگیز حُسن کی باریکیوں میں اُلجھ گیا۔

اس نے اپنی چشمِ تخیل میں کتھئی لباس میں ملبوس ایک جوان عورت کو دیکھا جس کے جسم سے چنبیلی کی خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ اس کے سر سے چادر ڈھلکی ہوئی تھی جس کی وجہ سے اس کے بالوں کی مانگ نظر آ رہی تھی۔ وہ کہیں کھڑی ہوئی شدت سے اس کی منتظر تھی۔

چند لمحوں کے بعد وہ ٹھنڈی آہیں بھرتا ہوا اپنے تخیل کے اڑن کھٹولے سے نیچے اترا اور چھت کی کڑیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بلاسبب مسکرانے لگا۔ کچھ دیر قبل اس کے لیے شعوری طور پر جس چیز کے لیے سوچنا محال ہو رہا تھا، اب اس کا ذہن اس کے بارے میں خودبخود سبک روی سے سوچنے لگا۔ شمیم کے تصور کے بعد اب وہ چاچی کا تصور باندھنے لگا۔ سوچتے سوچتے اس نے لحاف اتارا، چارپائی سے اتر کر کمرے کے دروازے کے پاس گیا اور اس سے کان لگا کر کچھ دیر تک ان کی آپس کی باتیں سننے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ دروازے کو دھکا دے کر اسی لمحے کھول دے اور اپنی آنکھوں سے انھیں قابلِ اعتراض حالت میں دیکھے۔ مگر اگلے ہی ثانیے وہ دروازے سے ہٹ گیا اور ٹہلتا ہوا برآمدے سے صحن میں آ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ پہلی ملاقات پر اسے کیا باتیں کرنی چاہییں اور کس انداز سے کرنی چاہییں؟ کس طرح چکنی چپڑی اور دل لبھانے والی باتوں کے ذریعے شمیم کو شیشے میں اُتارنا چاہیے؟ اس حوالے سے اسے خود پر اعتماد نہیں ہو رہا تھا کیونکہ ماضی میں دو مرتبہ پہلے بھی وہ ایسے معاملات میں ناکامی کی اذیت برداشت کر چکا تھا۔

اپنی بہن کی سہیلی سے پہلی بار ملتے ہی اس نے اس سے محبت کا اظہار کر دیا تھا۔ اس کے بےسلیقہ اظہار کا برا مان کر وہ لڑکی اس سے بدک گئی اور اس نے اس کی بہن سے بھی ہمیشہ کے لیے ملنا ترک کر دیا تھا۔ دوسرا واقعہ اسی قصبے میں پیش آ چکا تھا۔ ایک دن وہ پرائمری اسکول کی عمارت کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اس نے ایک لڑکی کو اپنے گھر کے دروازے سے باہر جھانکتے ہوئے دیکھا۔ وہ اسے پہلی نظر میں ہی بھا گئی۔ اس کے بعد وہ کئی روز تک اس کے گھر کے باہر چکر لگاتا رہا۔ کبھی کبھار وہ دکھائی دے جاتی لیکن ہر بار اسے دیکھتے ہی پردہ گرا کر اندر بھاگ جاتی۔ ایک شام وہ اسے ایک سنسان گلی میں دکھائی دے گئی۔ اس نے فوراً اپنا دل کھول کر اس کے سامنے پیش کر دیا۔ لڑکی نے اس کا دل اپنے پیروں تلے روند ڈالا اوراسے برابھلا کہتی ہوئی چلی گئی۔

اسے خدشہ تھا کہ شمیم بھی کہیں اس کی بےربط اور اکھڑی باتیں سن کر اس سے اکتا نہ جائے۔ پچھلے کچھ برسوں سے وہ شادی شدہ عورتوں سے تعلقات قائم کرنے کے خواب دیکھتا رہا تھا۔ اب اس نے لڑکیوں کو اپنی محبت کے لائق سمجھنا چھوڑ دیا تھا۔ ان کے نخروں کو برداشت کرنا اس جیسے کم ہمت کے بس کی بات نہیں تھی۔ جوانی کے حُسن اور فطری کشش کے باوجود اب قصبے کی لڑکیاں اسے بالکل اچھی نہیں لگتی تھیں۔

وہ اپنے خیالوں میں گم، صحن کے ٹھنڈی اینٹوں والے فرش پر چہل قدمی کرتا رہا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ صحن کے چاروں کونوں سے بچھو اور سانپ اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس احساس سے خوفزدہ ہو کر وہ فوراً بھاگ کر برآمدے میں پڑی ہوئی چارپائی پر چڑھ گیا اور رضائی اپنے جسم پر اوڑھ کر بیٹھ گیا۔

بستر یخ بستہ ہو رہا تھا۔ اپنی رضائی پاؤں پر اچھی طرح اوڑھنے کے باوجود بہت دیر تک اس کے پیر گرم نہیں ہو سکے۔ تنگ آ کر وہ انھیں اپنے ہاتھوں سے مَلنے لگا۔

اسے اپنی حماقت کا احساس بہت تاخیر سے ہوا۔ اوس سے بھیگی رات میں صرف شلوار قمیض پہنے ہوئے گھر سے نکلنا بہت دشوار تھا۔ کمرے میں رکھے ہوئے اپنے صندوق سے چادر، مفلر اور جرابیں نکالنا اسے یاد نہیں رہا تھا۔ اس کے پاس صرف بغیر آستینوں والا سویٹر تھا۔ اس سویٹر کی مدد سے سردیوں کی رات کی ٹھنڈ اور پالے کا رُکنا محال تھا۔

اسے محسوس ہونے لگا کہ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ گھڑی پر وقت دیکھنے کے لیے برآمدے کا بلب جلانا ممکن نہیں تھا۔ اس کے پاس کوئی ماچس بھی نہیں تھی۔ وہ چارپائی سے اُتر کے دبےپاؤں باورچی خانے کی کوٹھڑی تک گیا۔ اس کے ٹھنڈے ہاتھ چولھے کی راکھ اور اس کے گردوپیش کی زمین ٹٹولتے رہے لیکن اسے وہاں ماچس نہیں ملی۔ اندازے سے اس نے خانوں والی الماری کھول کر اس میں ہاتھ مارا تو وہاں اسے ماچس مل گئی۔ دیاسلائی جلا کر اس کے شعلے کی روشنی میں اس نے گھڑی پر وقت دیکھ ہی لیا۔ بارہ بج کر دس منٹ ہو رہے تھے۔ وہ دیواریں ٹٹولتا باورچی خانے سے باہر نکلا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا برآمدے میں اپنی چارپائی تک پہنچا۔ اس نے رات کے پالے سے بچنے کے لیے بستر سے چادر اتار کر اپنے گلے میں ڈال لی۔ پھر تکیے کو بستر کے درمیان رکھ کر اسے رضائی میں چھپا دیا تاکہ اگر کمرے سے کوئی باہر نکلے تو ابھری ہوئی رضائی دیکھ کر یہ سمجھے کہ وہ یہاں سو رہا ہے۔ رضائی کا اونچا ابھار بنا کر وہ خاصا مطمئن ہو گیا۔ اس کے بعد وہ دبے پاؤں چلتا ہوا گھر سے باہر نکلنے والے دروازے تک گیا۔ دروازے سے نکلنے کے بعد اس نے کنڈی چڑھا دی اور احتیاط سے چلتا گلی میں نکل گیا۔

گلی میں گہرا سناٹا تھا۔ موسمِ زمستاں کی یہ شب کہرآلود تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے آسمان سے یخ بستہ بوندیں برس رہی ہوں۔ گلی سے نہر کے پُل تک اسے بہت سی گلیوں سے گزرنا تھا۔ وہ اپنے بےاعتماد قدموں اور بےترتیب سانسوں کی آوازیں سنتا نپے تلے قدموں سے چلتا رہا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ بہت مرتبہ کی دیکھی بھالی اور دن کے وقت مہربانی سے پیش آنے والی گلیاں آدھی رات کو جانی دشمن کی طرح نظر آ رہی تھیں۔

چوکیدار کی سیٹی سن کر وہ ہر بارچونک جاتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا کہ وہ برابر والی گلی سے گزر رہا ہے۔ وہ اس کے قدموں کی آہٹ سننے کی کوشش کرتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ ہر گلی کے دونوں طرف دیواروں کا طویل سلسلہ تھا۔ ہر موڑ کے بعد نئی دیواریں آ جاتیں اور وہ ان کے بیچ سہما ہوا اور خوف سے لرزتا ہوا قدم بڑھاتا رہا۔

ایک ڈھلان کی چڑھائی چڑھنے کے بعد وہ نہر کے کنارے پر پہنچ گیا۔ تیز چلنے کی وجہ سے اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ قصبے کی آبادی سے نکل کر کھلی فضا میں آتے ہی اسے سردی زیادہ محسوس ہونے لگی۔ وہ درختوں کی قطار کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس کی نظریں پُل پر جمی ہوئی تھیں جو دور سے دھند اور کہرے میں لپٹا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے نہر کے پانی کی سطح پر چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے پانی میں موتی جگمگا رہے ہوں۔ رات کے اس پہر پُل ویران پڑا تھا۔ اس نے ٹھٹھرتے ہوئے تیزرفتاری سے چل کر پل عبور کیا۔ پل سے نیچے اتر کر اسے تھوڑی دور چلنے کے بعد دائیں جانب کی جھاڑیوں سے گاڑھا دھواں اُٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ دھواں دیکھتے ہی وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس نے چرس کی مخصوص خوشبو کو پہچان لیا تھا۔ وہیں کھڑے کھڑے وہ دھیرے سے کھنکارا تو اسے جھاڑیوں میں سے کسی کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ کھانسی کی آواز پہچانتے ہوئے وہ جھاڑیوں کی طرف چلا گیا۔ وہاں نورل جوگی اس کا انتظار کرتے ہوئے چرس کی سلفی پینے میں مگن تھا۔

رات کے اس پہر ہوا مکمل طور پر بند تھی۔ تمام چیزوں پر سکوت طاری تھا۔ آسمان کی چاروں انتہاؤں سے یخ بستگی زمین پر ٹپک رہی تھی اور دھیرے دھیرے ساری فضا میں پھیل رہی تھی۔ نذیر محسوس کر رہا تھا کہ اس کے کپڑے بھی آسمان سے گرتی اوس سے بھیگنے لگے تھے اور اس کی ناک کے نتھنوں میں سانسیں جم رہی تھیں۔ اس کے باوجود پکوڑافروش کی فراخدلانہ پیشکش ٹھکراتے ہوئے اس نے سلفی پینے سے انکار کر دیا۔ اس کے انکار کے بعد نورل جوگی نے بھی اصرار نہیں کیا۔ وہ نشے کی کثرت کے باوجود بچے رہ جانے والے اپنے ہوش وحواس کو بروےکار لاتے ہوئے نذیر کو گوٹھ میں واقع شمیم کے مکان کا حدوداربعہ سمجھانے لگا۔

”وہ دیکھو... اُس طرف! ہاں، وہ جو سیمنٹ سے بنی ہوئی صاف ستھری عمارت ہے نا، وہ ہمارے گوٹھ کی یونین کونسل ہے۔ کبھی بھول کر بھی اس کے قریب سے مت گزرنا۔ یونین کونسل کا چوکیدار شام ڈھلتے ہی اس کے باہر کتے چھوڑ دیتا ہے۔ بڑے مادرچود کتے ہیں وہ۔ ایک بار انھوں نے میری پنڈلی بھی نوچ کھائی۔ میں پورے چار مہینے چارپائی پر لیٹا رہا تھا۔ اچھا؟ ہاں، اس یونین کونسل سے کچھ آگے ہاریوں کی جھونپڑیاں ہیں۔ یہ سب کے سب ہاری گوپانگ قبیلے سے ہیں۔ گوپانگ پورے خیرپور میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی عورتیں ضلع بھر میں مشہور ہیں۔ ہر سال ہمارے جوگیوں کا بھی بہت سا روپیہ ان پر خرچ ہو جاتا ہے۔ اگر تمھاری ٹھرک بڑھ جائے تو بتانا۔“ بات کرتے کرتے وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

نذیر دیکھ رہا تھا کہ پکوڑافروش دن بھر قصبے میں جوتیا ں چٹخانے کے بعد اس وقت تھکن سے چور تھا اور نشے کی زیادتی کی وجہ سے اس کے اعصاب مضمحل لگ رہے تھے۔

اس نے مسکراتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ”یہ گوپانگ ہم جوگیوں کی عزت پر داغ ہیں۔ مگر ہم کیا کر سکتے ہیں؟ کچھ بھی نہیں کر سکتے! ان بھڑووں کو اپنے گوٹھ سے نہیں نکال سکتے کیونکہ ہمارے وڈیرے ایک نمبر کے رنڈی باز ہیں۔“

اس کی بےتکی باتیں سن کر نذیراونگھنے لگا تھا۔ اس نے ماچس کی تیلی جلا کر گھڑی پر وقت دیکھا۔ نورل سے چرس کا سگریٹ بنانے کی درخواست کرتے ہوئے اس کے دانت کٹکٹانے لگے تھے۔ اس کی آنکھیں شدید تکان کے سبب بند ہو رہی تھیں۔

نورل جوگی کے ہاتھوں نے چابکدستی سے سگریٹ بنا کر اس کی طرف بڑھایا۔ نذیر نے اسے دیاسلائی سے سلگاتے ہوئے ایک زوردار کش لگایا۔ سگریٹ پینے کے بعد وہ خود کو بہتر محسوس کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے پوری طرح اپنے ہاتھ پھیلا کر انگڑائی لی اور اس کے بعد ڈنڈ نکالنے لگا۔

وہ رات کے اس پہر ویران سڑک پر چلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ جھاڑیوں کے ساتھ ہی گنے کے کھیت واقع تھے۔ وہ جھاڑیوں کے بیچ چلتے چلتے گنے کے کھیتوں میں داخل ہو گئے۔ گنے کے قدآور پودے ان کے جسموں سے ٹکرا ٹکرا کر دھیما سا شور مچانے لگے۔ نورل نے اس کے پاس آ کر سرگوشی میں کہا، ”تمام گوٹھوں کے عاشقوں کے لیے کماد کی فصل خدا کی طرف سے ایک انمول تحفہ ہے۔“

یہ بات سن کر نذیر خود کو ہنسنے سے نہ روک سکا۔

گنے کی فصل میں کچھ دور تک چلنے کے بعد وہ رک گئے۔ انھوں نے فصل سے باہر سر نکال کر اِدھراُدھر دیکھا، پھر احتیاط سے دبے پاؤں چلتے ہوے گاؤں کی طرف جانے والا راستہ پار کیا اور تیزی سے پرلی طرف کے کھیت میں گھس گئے۔ چلتے چلتے نذیر کی چپلیں گیلی مٹی لگنے کی وجہ سے بھاری ہو گئی تھیں۔ مزید آگے جا کر پانی بہنے کی سرسراہٹ سنائی دی۔ یہ آواز پانی کے نالے سے آ رہی تھی۔ کچھ دور جانے کے بعد انھیں وہ نالہ دکھائی دینے لگا۔ سیمنٹ سے بنے ہوے اس نالے کے پاس جا کر فصل ختم ہو جاتی تھی۔

نورل نذیر کو نالے کے پاس، شیشم کے ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا ہونے کا مشورہ دے کر غائب ہو گیا۔ نذیر پگڈنڈی پر تیزی سے چلتے اس کے پیروں کی دھپ دھپ سنتا رہا۔ اس کے بعد وہ گردوپیش نگاہ ڈال کر آہستہ آہستہ چلتا شیشم کے پیڑ کی اوٹ میں جا کھڑا ہوا۔ کچھ دیر بعد وہ کھڑا رہ رہ کر تھک گیا تو نالے پر جا کر بیٹھ گیا۔ نالے کا سیمنٹ اس وقت یخ ہو رہا تھا۔

گوٹھ کے مکانوں کا پچھلا حصہ اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ وہ ان مکانوں میں شمیم کا مکان تلاش کرنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ بائیں طرف بنے ہوے تین پختہ مکانوں میں سے ایک میں شمیم رہتی تھی۔ کپاس کی لکڑیوں اور شرینہہ کے پیڑوں کے سایوں کی وجہ سے وہ ان مکانوں کے دروازے نہیں دیکھ سکا۔

وہ شیشم کے جس طویل قامت پیڑ کے نیچے کھڑا تھا اس نے جب اس کے موٹے سے تنے کو دیکھا تو اس کے رگ و پے میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ بچپن میں سنے ہوے بھوتوں اور چڑیلوں کے قصّے اسے یاد آنے لگے۔ وہ زمین پر پھیلے ہوے اس درخت کے سائے کو دیکھتا رہا۔

نجانے کیوں باربار اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ یہاں نہیں آئے گی، مگر اس کے باوجود وہ دیر تک وہاں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس نے گھڑی پر وقت بھی نہیں دیکھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اب شاید رات کے دو بجنے والے ہوں گے۔ وہ اپنے تخیل کی مدد سے سوچنے لگا۔ ”شاید وہ اپنے کمرے سے باہر آ گئی ہو مگر اپنے شوہر کو دھوکا نہ دینا چاہتی ہو اور برآمدے میں ٹہلتی ہوئی کوئی فیصلہ کرنے کی کوشش میں ہو۔“

اچانک ایک لرزا دینے والے خیال نے اس کے خوف میں اضافہ کر دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں پکوڑافروش نے اسے کوئی فریب نہ دیا ہو؛ کہیں اس کی سنائی ہوئی ساری باتیں جھوٹی نہ ہوں اور کہیں اس نے اس کے خلاف کوئی سازش تیار نہ کر رکھی ہو۔ اس کا ذہن مختلف وسوسوں اور اندیشوں سے بھر گیا۔ اسی کیفیت کے زیرِاثر وہ سیمنٹ کے نالے سے اُٹھ کر چلتا ہوا کماد کے کھیت میں جا چھپا۔ بہت دیر تک وہ وہاں چھپا سامنے کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہ شرینہہ کے دیوقامت پیڑوں کے سایوں پر جمی تھیں۔

اچانک اسے کسی کے قدموں کے نیچے کپاس کی سوکھی لکڑیوں کے کچلنے کی دھیمی دھیمی سی چرمراہٹ سنائی دی۔ اس کے بعد اس نے چاندنی میں وہاں ایک سائے کو حرکت کرتے ہوے دیکھا۔ وہ اطمینان کا سانس لیتے ہوے گنے کی فصل سے باہر نکلا اور شیشم کے درخت کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اب وہ واضح طور پر دیکھ رہا تھا کہ شمیم ہولے ہولے قدم اٹھاتی اس کی طرف بڑھتی آ رہی تھی، مگر چلتے چلتے وہ اچانک کھڑی ہو گئی۔ چادر میں لپٹی ہوئی شمیم نے اسے اشارہ کرتے ہوے اپنی طرف بلایا۔ اس کے اشارے پر وہ حواس باختگی سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا تیزی سے اس کے قریب پہنچا۔

شمیم لجاتے اور کسمساتے ہوے اس سے مخاطب ہوئی۔ ”نزدیک ہی ایک محفوظ جگہ ہے۔ آؤ چل کر وہاں بیٹھتے ہیں۔“

سردیوں کی رات کے گہرے سکوت میں اس کی آواز نذیر کو کسی شیریں نغمے جیسی محسوس ہوئی۔ وہ اس کی آواز کی تعریف کرنا چاہتا تھا مگر سر جھکائے چپ چاپ اس کے پیچھے چلنے لگا۔ سردی کے سبب اس کا جسم کپکپا رہا تھا۔ اس کے بند ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ آگے چلتی، کپڑوں میں سمٹی ہوئی عورت کو دیکھ رہا تھا جو بےآواز قدم اٹھاتی چل رہی تھی۔

کچھ دور جا کر وہ ٹھہر گئی۔ اسے دیکھ کر نذیر بھی رک گیا۔ نذیر نے جگہ کے انتخاب کی بہت تعریف کی۔ شمیم اسے بتانے لگی کہ اسے اس علاقے کے چپے چپے کی خبر تھی۔

آج بھی اس نے اپنا چہرہ نقاب میں چھپایا ہوا تھا۔ اندھیرے کے سبب وہ اس کی تابناک آنکھوں کو نہیں دیکھ سکا۔ اس کے جسم کا کوئی حصہ بھی چادر سے باہر نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے دو قدم پیچھے ہٹاتے ہوے اپنے چہرے سے نقاب اُتار دیا۔

نذیر بہت غور سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ زیادہ خوبصورت نہیں تھی مگر اس وقت اسے بےحد پر کشش محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سندھی گانوں کی مدد سے اس کی تعریف کرنے لگا۔ اس کے چہرے کو چاند اور آنکھوں کو ستاروں سے تشبیہ دینے لگا۔ ایک نوجوان لڑکے سے اپنی تعریفیں سن کر شمیم مسکرانے لگی۔ وہ کئی برسوں کے بعد کسی کے ہونٹوں سے اپنی اتنی تعریف سن رہی تھی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ اسے اپنی معمولی زندگی کی معمولی سی باتیں مزے لے لے کر سنانے لگی۔

نذیر کو حیرت ہو رہی تھی کہ اب تک اس نے اپنے شوہر کے خلاف کوئی جملہ نہیں کہا تھا، جبکہ پکوڑافروش نے اسے بتایا تھا کہ ان دونوں کے تعلقات ٹھیک نہیں چل رہے۔

شمیم کو نذیر سے ملاقات کے لیے جن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا وہ ان کا بیان مبالغہ آرائی سے کرتی رہی۔ اس کی گنگناتی آواز سنتے ہوئے وہ اپنی تمام اذیت بھول گیا۔ وہ صرف اس کی صورت دیکھتا اور اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس نے اس کے نزدیک کھڑے ہو کر اس کے بالوں کی مانگ کو دیکھا، پھر اس کی پیشانی اور اس کی آنکھوں کو، اس کے بعد اس کے ہونٹوں اور گالوں کو۔ اس نے اس کی جلد کی سفید رنگت کو دیکھا۔ اس کی کلائی کی چوڑیوں کو دیکھا جو باربار خودبخود کھنک پڑتی تھیں۔ اس کا مترنم اور دھیما لہجہ اس پر فسوں طاری کر رہا تھا۔ اوڑھی ہوئی چادر کے باوجود اس کے سینے کا ابھار صاف دکھائی دے رہا تھا۔

شمیم بھی اس کی نظروں سے غافل نہیں تھی۔ وہ اس کی نگاہوں کی خاموش تعریف سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اچانک کسی احساس کے زیرِاثر اس کے لہجے کی بےساختگی ختم ہو گئی اور وہ اٹک اٹک کر باتیں کرنے لگی۔

نذیر کے لیے یہ لمحات اس کی زندگی کے سب سے زیادہ مسرور لمحات تھے۔ ایک شادی شدہ جوان خاتون اس کے پہلو میں تھی اور اس کی خاطر اپنی جان داؤ پر لگا کراس سے ملنے آئی تھی۔ وہ دونوں آنے والے دنوں میں اپنی ملاقاتوں کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔

شمیم نے اسے بتایا کہ آئندہ اس کے لیے رات کے وقت کھیتوں میں آنا ممکن نہیں ہو گا۔ وہ خوفزدہ تھی۔ اس نے کہا کہ وہ اس سے ملنے کے لیے کوئی اور بندوبست کرے گی۔ اس نے اپنے دل میں امڈتی ہوئی محبت کا اظہار کیا اور نذیر کی تعریفیں کرنے لگی۔ وہ مسکرایا اور اس نے موج میں آ کر، آگے بڑھ کر شمیم کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اس نے پہلی بار نسوانی جسم کے اضطراب اور اس کی نرمی کو محسوس کیا۔ اسے لگا کہ وہ ریشم کے نرم و ملائم تھان سے لپٹ گیا ہے۔ وہ اس کے بازوؤں میں کسمسانے لگی۔ اس کے بدن سے اٹھتی کسی عطر اور پاؤڈر کی خوشبو اسے بےحد مسحورکن محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے پہلابوسہ اس کے داہنے ہاتھ پر دیا، وہ جس کی مدد سے اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ نذیر نے اپنے ہاتھوں سے اس کے دونوں ہاتھ ہٹا کر اس کے نرم ہونٹوں کو چومنے لگا۔ وہ ان لمحوں کے ذریعے اپنی زندگی بھر کی محرومی کو سیراب کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کی چادر پر ہاتھ پھیرتے ہوے اس میں چھپی ہوئی اس کی چھاتیوں کو محسوس کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اسے نجانے کیا ہوا کہ وہ اس کی چادر کو چومتے چومتے اس کے سینے سے نیچے آیا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

شمیم گڑبڑا گئی۔ اس نے اس کے بوسوں کے خلاف برائے نام مزاحمت کی۔ اس نے اپنے نوآموز عاشق کے وحشی پن کا بڑا نہیں مانا اگرچہ اس کے تیزوتند بوسوں نے اس کے انگ انگ میں ہیجان برپا کر دیا تھا۔ نذیر بھی اپنے آپ میں نہیں تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ کر اس کی ٹانگوں کو بھینچتا رہا۔ اس صورتِ حال میں شمیم کو خود کو سنبھالنے کا موقع مل گیا۔

کچھ دیر بعد وہ زمین سے اٹھا اور اس نے دوبارہ اس کی کمر کے گرد بازو ڈالنے کی کوشش کی مگر اس مرتبہ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے دھیمے لہجے میں اسے سرزنش کی۔

عورت کے جسم سے پہلی ہم آغوشی نے نذیر کو نشے سے چُور کر دیا تھا۔ وہ اس کے ہمراہ زمین پر اگی ہوئی گھاس پر، گنے کے کھیتوں میں، شیشم کے پیڑ کے نیچے، غرض ہر جگہ بوس و کنار کرنا چاہتا تھا، اس کے جسم کو آغوش میں لے کر رقص کرنا چاہتا تھا، مگر شمیم نے اگلے ہی ثانیے اسے دھکا دے کر سب کچھ ختم کر دیا۔ وہ نذیر پر طاری ہونے والی پیار کی وحشت سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اس سے الگ ہوتے ہی وہ اپنی بھٹکتی ہوئی سانسوں کو سنبھالنے لگی۔ نذیر نے اس کے قریب آ کر اس سے اپنے رویے پر معذرت کی تو وہ مسکرانے لگی۔

اگلے ہی لمحے اس نے رخِ روشن نقاب میں چھپا لیا۔ نذیر سے مخاطب ہو کر اس نے اسے”اللہ وائی“ کہا اور اس کے بعد پلٹ کر سبک خرامی سے چلتی ہوئی، دیوقامت شرینہہ کے درختوں کے سائے میں غائب ہو گئی۔

اس کے جانے کے فوراً بعد نذیر کو احساس ہوا کہ شاید اس نے اپنے رویے سے اسے سہما دیا۔ اپنے احمقانہ رویے کی تلافی کی خاطر اس نے اسے آواز دی مگر اس کی آواز گوٹھ کے مکانوں کے درودیوار سے ٹکرا کر واپس آ گئی۔ وہ دیر تک وہیں پر مبہوت کھڑا اسی سمت دیکھتا رہا، کچھ دیر پہلے وہ جس طرف گئی تھی۔

گھر سے گوٹھ ہاشم جوگی کی جانب آتے ہوے خوف کے سبب نذیر کے رگ و ریشے میں جو کپکپی طاری تھی، واپس جاتے ہوے اس کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ آتے ہوے اسے جو راستہ طویل اور لامتناہی محسوس ہو رہا تھا، واپسی پر اسے پتا ہی نہیں چلا اور وہ سبک روی سے چلتا ہوا گھر تک پہنچ گیا۔

صبح کو چاچی خیرالنسا اس کی چارپائی کے پاس کھڑی ہو کر اسے جگانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس نے گنگناتے ہوے دھیمے لہجے میں دو تین مرتبہ اس کا نام پکارا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کی گہری نیند پر وہ حیرت سے کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ وہ لحاف اوڑھے اوندھے منھ بستر پر سو رہا تھا۔ اس کا جسم مکمل طور پر بےحس تھا اور اس کی اکھڑی ہوئی، بےترتیب سانسوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ آخر تنگ آ کر چاچی نے اس کے چہرے سے رضائی اُتار دی۔ اس کی آنکھیں زور سے مندی ہوئی تھیں اور اس کے ہونٹ آپس میں ایک دوسرے سے مضبوطی سے جڑے ہوے تھے۔

وہ اس کے ہونٹوں کی سرخی کو اچھی طرح جانتی تھی کیونکہ اکثر خوابوں میں وہ اس کے سرخ ہونٹوں کو چوم چکی تھی۔ مگر اس وقت وہ اس کے ہونٹوں کی نیلاہٹ دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ چاچی نے جھجکتے ہوے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے چھوا، پھر اس کے گالوں اور ہونٹوں کو مس کیا۔ اسے اس کی پیشانی، گالوں اور ہونٹوں سے خفیف سی گرم لہریں اٹھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ ا س نے فوراً اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور گھبرائی ہوئی کمرے کے دروازے سے اندرجھانکنے لگی۔

اس کا شوہر وہاں گہری نیند سو رہا تھا۔ یہ اطمینان کرنے کے بعد وہ دوبارہ نذیر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ بیمار ہو گیا ہے۔ اس نے جھک کر اس کے کندھے کو دھیرے سے ہلایا مگر اس مرتبہ بھی اس نے کوئی جنبش نہ کی۔

اس نے فکرمندی سے آس پاس نظر دوڑائی اور صحن میں بڑھتی ہوئی روشنی کو دیکھا۔ فجر کی نماز کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ اس نے نذیر کو اس کے حال پر چھوڑا اور خود دیوار پر کیل میں لٹکا ہوا مصلّیٰ اتار کر اسے زمین پر بچھانے لگی۔

ابھی اس نے مصلیٰ بچھایا ہی تھا کہ اسے نذیر کے منھ سے نکلتی بےمعنی آوازیں سنائی دیں۔ اس کے جسم نے اضطراب سے ایک کروٹ لی اور اس کا لحاف اس کے جسم سے اتر کر نیچے جا گرا۔

نذیر کی طرف دیکھتے ہی چاچی کو فوراً محسوس ہوا کہ اس کا وضو ٹوٹ گیا ہے۔ ایک سنسنی سی اس کے تن بدن میں گہرائی تک دوڑتی چلی گئی۔ کسی مقناطیسی کشش نے اس کی آنکھوں کو اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ اپنی نظر کو وہاں سے نہیں ہٹا سکی۔ اس کی آنکھیں چند لحظوں تک اس کی مرضی کے خلاف پلکیں جھپکے بغیراس منظر کو دیکھتی رہیں۔ اس کا چہرہ ذرا سی دیر میں سرخ ہو گیا اور اس کے کانوں کی لویں گرم ہونے لگیں۔ اس نے زیرِلب مسکراتے ہوے اوڑھی ہوئی چادر کا کونا اپنے دانتوں میں دبا لیا، مگر اگلے ہی لمحے وہ توبہ استغفار کرتی ہوئی اپنے آپ کو ملامت کرنے لگی۔

مصلّے کو دیوار پر دوبارہ لٹکا کرایک مرتبہ پھر اس نے کمرے میں جھانکا اور اطمینان کرنے کے بعد وہ دھیرے دھیرے چلتی چارپائی کے قریب گئی۔ وہ دانستہ طور پر اب کوشش کر رہی تھی کہ اس کی نظر نذیر کے جسم پر نہ پڑے۔ اس نے اپنی نظریں پرے لے جاتے ہوے زمین سے رضائی اٹھا کر اسے دوبارہ اُڑھا دی۔

اپنی نگاہوں کی کوتاہی پر وہ اپنے آپ کو سرزنش کرنے لگی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کا وضو ٹوٹ چکا ہے۔ ہینڈپمپ سے نکلتے ٹھنڈے پانی کے باوجود اسے دوبارہ وضو کرنا پڑا۔

اس دوران صحن اور برآمدے میں روشنی پھیل گئی تھی۔ اس نے پڑوسیوں کی چھت پر گرتی سورج کی شعاعوں کو دیکھا تو ایک مرتبہ پھر استغفار کرتی، جلدی سے مصلیٰ بچھا کر نماز قضا کر کے پڑھنے لگی۔

نذیر کے جسم کے منظر کو ذہن سے نکالنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس نے جیسے تیسے نماز ختم کر کے یہ فرض ادا کیا۔ اس کے بعد اس نے کمرے میں جا کر اپنے شوہر کو نیند سے جگایا اور خود باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

کچھ دیر کے بعد غفور کھانستا ہوا صبح کی چائے پینے کے لیے باورچی خانے میں آیا تو وہ اسے نذیر کی صحت کے بارے میں بتانے لگی۔ ”پتا نہیں آج اسے کیا ہو گیا ہے۔ میں نے کئی دفعہ اسے جگایا مگر ایک بار بھی اس کی آنکھ نہیں کھلی۔“

جب وہ دونوں چائے پی چکے تو اٹھ کر برآمدے میں سوئے ہوے نذیر کے پاس گئے۔ چاچی ذرا پیچھے ہٹ کر فاصلے پر کھڑی ہو گئی جبکہ غفور اپنے بھتیجے کو جگانے میں مصروف ہو گیا۔ جھنجھوڑے جانے پر نیند کے عالم میں اس کا بدن کسمسایا اور اس نے عجیب انداز سے ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوے آنکھیں کھول دیں اور حیرت سے ان دونوں کو تکنے لگا۔

”کیا بات ہے نذیر؟ تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ غفور چاچا نے فکرمندی سے پوچھا۔

”ہاں، میں ٹھیک ہوں۔“ وہ آنکھیں مسلتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے اٹھ کر بیٹھنے پر وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔

”جوانی کی نیند بہت دیوانی ہوتی ہے،“ چاچے نے شرارت آمیز نظر سے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوے کہا۔

نذیرانگڑائی لے کر اٹھنے کے بعد کچھ دیر ٹانگیں لٹکائے اور سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر چارپائی سے اٹھتے ہوے بڑبڑایا: ”پتا نہیں کیوں، آج میرے جسم میں درد ہو رہا ہے۔“ اس کی آنکھیں گہری سرخ ہو رہی تھیں اور اس کا چہرہ کمزور لگ رہا تھا۔

”اچھا، آج تُو گھر پر آرام کر لے۔ دکان میں چلا جاتا ہوں،“ غفور چاچا نے تشویش سے اس کی طرف دیکھتے ہوے کہا۔

”ٹھیک ہے،“ جواب دیتے ہوے وہ غسل خانے کی طرف چلا گیا۔

واپس آ کر نذیر دوبارہ چارپائی پرلیٹ گیا۔ اس کے سر میں تیز درد ہو رہا تھا۔ اس کے منھ کا ذائقہ شاید کل رات چرس پینے کی وجہ سے اب تک کڑوا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر موٹی سی پپڑی جمی ہوئی تھی۔ اس کا حلق اس طرح سوکھ رہا تھا جیسے اس نے کئی دن پانی پیے بغیر طویل مسافت طے کی ہو۔ وہ لحاف میں دبکا ہوا اپنی عجیب حالت پر سوچ رہا تھا۔ کل شب کے لذت بھرے واقعے کی وجہ سے اس کے بدن کو سبک اور لطیف ہونا چاہیے تھا، مگراس وقت اس کے بدن کا عضو عضو درد سے اینٹھ رہا تھا۔ اس کے باوجود اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوے اسے باربار شمیم کے ہونٹوں کی نرمی یاد آ رہی تھی۔ وہ حیرانی سے سوچ رہا تھا۔ شب کے تیسرے پہر اس مہربان عورت کے چلے جانے کے بعد وہ بہت دیر تک زمین پر گھٹنے ٹیکے، اسے جاتے ہوے تکتا رہا تھا۔ اس وقت اس نے اپنے آپ کو وہ زمین خیال کیا تھا جس کی چھاتی پر پاؤں دھرتی ہوئی وہ جس طرف سے آئی تھی اسی طرف واپس لوٹ گئی۔ رات میں فضا سے گرنے والی اوس نے نہ صرف اس کے کپڑوں کو گیلا کیا تھا بلکہ زمین پر اگی ہوئی گھاس کا سبز رنگ بھی ان پر لگ گیا تھا۔ اس وقت وہ خوف کی جگہ سخت اذیت میں مبتلا تھا۔ اس کے پیٹ میں عجیب سے مروڑ اٹھ رہے تھے اور اس کی ٹانگوں سے جیسی ساری جان نکل گئی ہو۔ مسکراتے ہوے اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا، ”ایسی حسین اور دلربا رات کی خاطرایسی لاکھ اذیتیں بھی برداشت کرنی پڑیں تو کر لینی چاہییں۔ اس سخی عورت کی وجہ سے آخر میری انگلیوں نے پہلی بار خالص نسوانی لمس کا ذائقہ چکھا ہے اور میرے ترسے ہوے ہونٹ بوسوں کی لذت سے ہم کنار ہوے ہیں۔“ اس نے ایک لذیذ سی آہ بھرتے ہوے بستر پر کروٹ لی۔

کچھ دیر بعد چاچی خیرالنسا اس کے لیے چائے کا پیالہ ہاتھ میں لیے ہوے چارپائی کے پاس آئی اور اسے مخاطب کر کے چائے پینے کے لیے کہا۔ نذیر نے اٹھ کر اس کے ہاتھوں سے چائے کا پیالہ لیتے ہوے اپنی انگلیاں اس کے پورے ہاتھ کے ساتھ مس کیں۔ نذیر نے جرأت سے اپنا سر اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس نے اپنی نظریں جھکا لیں اور اپنا ڈوپٹہ ٹھیک کرتی ہوئی فوراً چلی گئی۔ وہ گم سم ہو کر اس کے ہاتھوں سے بنی میٹھی چائے کی چسکیاں لینے لگا۔

کچھ وقت گزرنے کے بعد چاچا غفور اسے ڈاکٹر کے پاس جا کر دوا لینے اور آرام کرنے کی تنبیہ کرکے گھر سے باہر چلا گیا۔

چاچی خیرالنسا اسٹیل کی تھالی میں اس کے لیے دو اُبلے ہوے انڈے لے آئی۔ اس کی چارپائی پر اس کے قریب بیٹھ کر وہ انڈوں پر سے چھلکے اُتارنے لگی۔ اسے کام میں محو دیکھ کر وہ اپنی آنکھوں سے چاچی کا جسم ٹٹولنے لگا۔ وہ بھی اپنے لباس کی شکنوں سے بےنیاز تھی۔ معاً وہ انڈے چھیلتے ہوے کہنے لگی، ”مجھے لگتا ہے کہ تجھے بخار ہو گیا ہے۔ اور دیکھ! سردی کا بخار اچھا نہیں ہوتا۔ میں دن میں تین بارانڈے ابال کر تجھے کھلاؤں گی۔ تیرا چاچا دکان سے کسی کے ہاتھ مرغی کا گوشت بھی بھجوا دے گا۔ یخنی پی کر تیری صحت بہتر ہو جائے گی۔ سوتے میں تجھے اپنی رضائی کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ رضائی اترنے سے تجھے سردی لگ گئی ہے۔“

وہ انڈے کا ٹکڑا اپنے منہ میں رکھتے ہوے بولا، ’’معاف کرنا چاچی، میری وجہ سے تجھے تکلیف کرنی پڑی۔ تیری پریشانی ختم ہونے کے بجاے بڑھ گئی۔ چاچا بھلاچنگا ہوا تو اب میں بیمار پڑ گیا۔‘‘

اپنی صبح سے اب تک کی مصروفیت کا حال سنانے کے بعد چاچی نے اس سے کہا، ’’تُو آرام سے بیٹھ کر یہ کھا، میں تیرے لیے صحن میں چارپائی بچھا دیتی ہوں۔ تجھے دھوپ اچھی لگے گی۔ کام سے فارغ ہو کر میں تیرے سر کی مالش بھی کر دوں گی۔ ‘‘

’’ہاں چاچی، واقعی میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔‘‘ وہ دل جمعی سے انڈے کھانے لگا۔ انڈے کا آخری ٹکڑا منہ میں رکھ کر وہ اٹھا اور تیز دھوپ میں جا کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر آسمان کی طرف دیکھا تو دیکھ نہیں سکا۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اور وہ لمبے سانس بھرنے لگا۔

اس نے چاچی خیرالنسا کو جھک کر چارپائی اٹھاتے ہوے دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ وہ اس کی قمیض سے باہر آتی چھاتیوں کو تکتا ہی رہ گیا۔ یہ منظر دیکھتے ہوے اچانک اس کا سر چکرایا۔ وہ صحن میں گرتے گرتے بچا۔

چارپائی کے صحن میں بچھتے ہی وہ تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ کچھ ہی دیر میں اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ گہری نیند سو گیا۔

دو روز تک اس کا بخار نہیں اترا اور وہ گھر سے باہر نہ جا سکا۔

شمیم سے ملاقات کی یاد دھیرے دھیرے اس کے ذہن سے محو ہوتی جا رہی تھی۔ جب بھی اس ملاقات کا عکس اس کی نگاہوں میں جھلملاتا تو خودبخود چپکے چپکے مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل جاتی اور وہ جلدازجلد صحت یاب ہونے کی خواہش کرنے لگتا۔

اسے غسل کیے ہوے بھی تین روز گزر گئے تھے۔ اس کی گردن پر میل کی تہہ جم گئی تھی اور اسے اپنے بدن میں سوئیاں سی چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

بخار کے پہلے روز تو وہ چاچی خیرالنسا کی خدمت سے بہت لطف اندوز ہوا۔ اسے کھاٹ پر اُبلے ہوے انڈے، گرم یخنی اور چائے وغیرہ ملتی رہی۔ شام کو اس نے اس کے لیے خس خس کا حلوہ بھی تیار کیا۔ دوسرے دن چاچی سرسوں کے تیل سے اس کے سر کی مالش کرنے لگی تو وہ تلملا اُٹھا۔ اس کے بھاری ہاتھوں کی رگڑ اتنی تیز تھی کہ اس نے اس کی منّتیں کر کے اپنی جان چھڑائی۔ اسے حیرت ہوئی کہ جن ہاتھوں کو کئی مرتبہ اس نے چومنے کی خواہش کی تھی وہ درحقیقت کتنے سخت اور کٹھور نکلے۔

چارپائی پرلیٹے لیٹے وہ عاجز آ گیا تھا۔ کئی بار وہ اٹھ کر صحن میں چہل قدمی کرنے لگا اور دروازے کے پاس جا کر گلی میں بھی جھانکنے لگا۔

گھر میں رہتے ہوے اس نے کسی معاملے پر بھی احتجاج نہیں کیا۔ وہ اپنی پیاری چاچی کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ اس کے سر کی مالش کر رہی تھی تو اس دوران اس کا سر بارہا نرم اور گداز چھاتیوں سے ٹکرایا تھا اور ہر بار چاچی نے کسمسا کر، ذراسا لجا کر اپنے سینے کو پیچھے ہٹا لیا تھا۔ ایک آدھ بار اس نے بڑبڑا کر خود کو ملامت بھی کی تھی۔ نذیر کو سر کی مالش کروانا پسند نہیں تھا مگروہ زبردستی اس کے سر کی مالش کرتی رہی تھی۔

ایک مرتبہ تو نذیر کی صحت یابی کے لیے اس نے گیارہ دفعہ سورۂ یٰسین پڑھ ڈالی اور جب اس پر پھونک مارنے کے لیے وہ اس کے قریب ہوئی تو نذیر نے شرارت کرتے ہوے اچانک اپنا سر اٹھا کر اس کے ہونٹوں کا بوسہ لے لیا تھا، جس پر وہ اس سے کچھ دیر کے لیے خفا بھی ہو گئی تھی۔ وہ ایک بوسہ اس کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا مگر وہ زیادہ عرصے تک اس بوسے کو یاد نہیں رکھ سکا۔

آج کا سورج بھی غروب ہو چکا تھا اور آسمان پر پھیلی شفق معدوم ہوتی جا رہی تھی۔

اسے اپنے معمولات کی یکسانیت پر وحشت سی ہونے لگی تھی۔ آج پورے تین دن ہو گئے تھے اور اس نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ اسے معلوم تھا، اس کے لیے نئی ملاقات کا سندیسہ لے کر نورل جوگی قصبے کی گلیوں اور چائے خانوں

میں اسے ڈھونڈتا پھر رہا ہو گا۔

اس کے دل میں چاچی کے لیے کینہ توز مخاصمت بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اچھی طرح جان گیا تھا کہ وہ اس کے سامنے کبھی بھی کھل کر اپنے جذبات کو ظاہر نہیں کرے گی۔ اس کے رویے میں ہمیشہ ایک پراسراریت رہے گی۔ وہ کبھی اس بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکے گا کہ وہ آخر اس سے کس بات کی متقاضی تھی؟ وہ پورے ایک دن تک اس سے اس کے معمولی بوسے پر خفا رہی جبکہ مالش کے دوران وہ خود اپنا سینہ اس کی پیٹھ سے ٹکراتی رہی تھی اور اس پر خود ہی نادم بھی ہوتی رہی تھی۔

نذیر نے سوچا کہ شمیم تک رسائی کے بعد اسے غیرضروری چیزوں میں نہیں الجھنا چاہیے۔ چاچی خیرالنسا کے معاملے میں اس کا جلد یا بدیر احساسِ گناہ سے دوچار ہونا طے ہو چکا تھا اور اس گناہ کے نتیجے میں خاندان بھر میں اس کا ذلیل و رسوا ہونا بھی طے ہو چکا تھا۔

شام ڈھلتے ہی گھر کے دروازے پر تیز دستک ہوئی۔ نذیر نے جا کر کنڈی کھولی تو باہر حیدری کھڑا اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اس نے ہاتھ ملاتے ہوے اسے جلدی سے بتایا کہ نورل جوگی پہلوان کے چائے خانے پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہے۔ نذیر کے دل میں نجانے کیا سمائی کہ وہ چاچی خیرالنسا کو بتائے بغیر اس کے ساتھ چل دیا۔

راستے میں حیدری اس سے چھیڑچھاڑ کرتا رہا۔ اس نے شکایت کی کہ وہ پچھلے کچھ دنوں سے اسے نظرانداز کر رہا ہے۔ وہ دراصل اب اس کے راز جاننا چاہتا تھا، مگر نذیر ہوشیار تھا، اس نے اسے عام سی باتیں بتا کر اپنی جان چھڑانے کی کوشش کی۔ اس نے دوست کا دل رکھنے کی خاطر روکھے پھیکے انداز سے رات کی اپنی مہم کو بیان کیا۔ پھر اسے اپنی بیماری کے متعلق بتانے لگا۔

پہلوان دستی کے چائے خانے تک پہنچنے تک حیدری کی ساری چونچالی ختم ہو گئی اور وہ دل ہی دل میں اپنے دوست سے حسد کرنے لگا کیونکہ اس کی کسی عورت سے دوستی نہیں تھی۔

نذیر گھر میں اپنی تین دن کی اسیری سے نکل کر چائے خانے کے ماحول میں قید نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے رفیقوں سے درخواست کی کہ وہ قصبے سے باہر نکلنے والی سڑک پر چہل قدمی کے لیے اس کے ساتھ آئیں۔

وہ تینوں اپنی بےتکی باتیں کرتے ہوے سڑک پر ٹہلنے لگے۔ سڑک پر واقع دکانیں کچھ دور تک جا کر ختم ہو گئیں۔ وہ تعلقہ ہسپتال کے قریب سے گزرے، پھر آگے چل کر ٹاؤن کمیٹی اور سیشن کورٹ کی عمارتیں آئیں۔ واٹرسپلائی کی اونچی ٹنکی تاریکی میں کسی دیو کی طرح کھڑی نظر آ رہی تھی۔ سڑک پر بجلی کے کھمبوں میں بلب نہیں تھے۔

نورل جوگی اپنی اندھی عقیدت کے جوش میں چند روز پیشتر گردونواح میں رونما ہونے والے ایک معجزے کا ذکر کرنے لگا۔ اس کے خیال میں یہ معجزہ قیامت کے نزدیک آنے کی علامت تھا۔ وہ جوشِ عقیدت سے کہہ رہا تھا، ”ہم ظالم لوگ ہیں، ظالم لوگ! سادات خاندان کے معصومین پر ہونے والے جبر کو چپ چاپ سہہ گئے۔ ہم باطل کی آواز میں آواز ملاتے رہے۔ پہلے سیہون شریف میں سیاہ عَلم پر حضرت امام حسین کا سر دکھائی دیا ہے۔ ان کے چہرے پر نور ہی نور تھا اور ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ان کی مسکراہٹ حقیقت میں حق کی فتح ہے۔ سیہون شریف کے بعد اب سیٹھارجہ اور پیر وسن میں بھی امام عالی مقام کی شبیہ نظر آئی ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ہاں۔ معجزہ ہے، معجزہ!“

نذیر اور حیدری اس کی باتوں پر اور اس کے جذباتی انداز پر ہنستے رہے۔

حیدری نے مذاقاً اس کے چٹکی لی۔ ”بھنگ اور چرس پی کر تو چاروں طرف شبیہیں ہی شبیہیں نظر آتی ہیں۔“

نورل جانتا تھا کہ اس کا والد وہابی ہے مگر وہ اس بات پر حیران بھی تھا کہ اس کے وہابی باپ نے آخر کیا سوچ کر اس کا نام حیدری رکھ دیا تھا۔ اس کی یہ بات سن کر حیدری پھٹ پڑا۔ نذیر بہ مشکل ان دونوں میں صلح کروا کر انھیں چپ کروا سکا۔

وہ تینوں ہائی اسکول کے میدان میں جا بیٹھے۔ کھیل کا یہ میدان ناہموار تھا اور وہاں جابجا خودرو جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ نذیر کی فرمائش پر نورل چرس کا سگریٹ بنانے لگا۔ اس دوران حیدری چرس اور شراب کا موازنہ کرنے لگا۔ اس کے خیال کے مطابق شراب چرس سے بہت بہتر تھی۔ اس کی باتیں سنتے ہوے پکوڑافروش کے لیے خاموش رہنا محال ہو گیا۔

وہ اس کے خیال کو باطل قرار دیتے ہوے چرس کی خوبیاں بیان کرنے لگا۔ کچھ دیر تک وہ دونوں آپس میں الجھتے رہے۔ نذیر خاموشی سے گردوپیش کے ماحول کو دیکھتا رہا۔

چاند مشرقی سمت سے آسمان پر طلوع ہو چکا تھا۔ شام کی مدھم مدھم ہوا چل رہی تھی۔ سڑک تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بہت دور واقع پٹرول پمپ کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔

نورل نے چرس کا سگریٹ بنانے کے بعد اسے دیاسلائی دکھا کر سر کیا اور اس کا طویل کش لیا۔ اس کے بعد وہ کھنکھار کر گلا صاف کرنے کے بعد سنجیدگی سے کہنے لگا، ”کل شمیم میری بیوی سے ملنے آئی تھی۔ وہ بتا رہی تھی، کل وہ سچل سرمست کے مزار پر حاضری کے لیے درازہ شریف جائے گی۔ اس کے ساتھ اس کے شوہر کے علاوہ میری بیوی بھی ہو گی۔ وہ سب وہاں رات گزار کر صبح واپس آ جائیں گے۔“

”کیا اس نے میرے لیے کوئی پیغام بھیجا ہے؟ کیا وہ چاہتی ہے کہ میں بھی وہاں آؤں؟“

”ہاں، اس نے پیغام بھیجا ہے کہ تم ضرور آؤ،“ نورل نے اسے سگریٹ تھماتے ہوے کہا۔

نذیر نے سوال پوچھا، ”کیا تم نہیں چلو گے؟“

”میں نہیں جاؤں گا ہوبتار۔“

”اگر میں تم سے چلنے کی درخواست کروں تو؟“

پکوڑافروش جواب دینے کے بجاے مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں اس کی رضامندی پنہاں تھی۔

نذیر کے لیے پوری رات گھر سے باہر گزارنا مشکل تھا۔ اگر وہ چاچی سے اجازت مانگتا تو وہ اسے چاچے سے بھی اجازت دلا دیتی مگر وہ چاچی سے مدد مانگنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کی گھر سے باہر شب گزاری کے حوالے سے خوامخواہ شک میں مبتلا ہو سکتی تھی۔

حیدری کے تعاون سے اس کی یہ دشواری حل ہو گئی۔ اس نے دکان پر جا کرچاچے غفور سے درخواست کی کہ کل رات ہنگورجہ میں اس کے رشتےدار کی شادی ہونے والی ہے اور وہ نذیر کو وہاں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ حیدری سے یہ سن کر چاچے غفور کو حیرت ہوئی کہ اس کے گھروالوں نے شادی کے موقع پر اس سے کپڑے کیوں نہیں سلوائے؟ حیدری نے اسے اطمینان دلایا کہ وہ ان کے دور پرے کے رشتےدار ہیں اور دور کے رشتے داروں کی شادی کے لیے ایسے لوازمات کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کی مضبوط دلیل سن کر چاچا غفورنے نذیر کو جانے کی اجازت دے دی۔

سچل سرمست کے مزار پر شب گزارنا دونوں دوستوں کی پرانی خواہش تھی۔ حیدری نے بھی اپنے والد سے جھوٹ بول کر درازہ شریف جانے کی اجازت حاصل کر لی۔

پکوڑافروش نے انھیں پہلے سے ہی بتا دیا تھا کہ وہ لوگ ڈھائی بجے والی بس سے پہلے ہنگورجہ جائیں گے، پھر وہاں سے بس تبدیل کر کے درازہ شریف کے لیے دوسری بس میں سوار ہوں گے۔

وہ دونوں قصبے کے مختصر سے بس اسٹاپ پر دوپہر ڈھائی بجے سے پہلے ہی پہنچ گئے اور کھڑکھڑاتی ہوئی گول باڈی بس کے قریب کھڑے ہو کر ان کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ دوپہر کو قصبے سے باہر جانے والے لوگوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ پھر بھی انھوں نے بس کی سیٹوں پر ایک رومال رکھ کر اپنے لیے نشستیں محفوظ کر لیں۔ وقت گزارنے کے لیے وہ دونوں مونگ پھلیاں کھاتے رہے۔

کچھ دیر بعد انھوں نے دو عورتوں اور دومردوں پر مشتمل ایک چھوٹی سی ٹولی کو اس طرف آتے ہوے دیکھا۔ مرد آگے چل رہے تھے جبکہ دونوں عورتیں ان کے پیچھے آ رہی تھیں۔ انھوں نے دیکھا کہ پکوڑافروش تو اپنے پرانے اور بوسیدہ لباس میں تھا جبکہ شمیم کا ٹیلی فون آپریٹر شوہر عجیب رنگ میں نظر آ رہا تھا۔ اس نے کلف سے اکڑا ہوا سفید لباس اور اس پر سرخ رنگ کی واسکٹ زیب تن کی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ گردن میں اجرک، سر پر شیشے کے کام والی سندھی ٹوپی اور آنکھوں پر سیاہ چشمہ بھی لگا رکھا تھا۔ وہ میلہ گھومنے نکلا تھا۔

نذیر نے برقعے میں شمیم کو پہچان لیا۔ آج نذیر کو اس کی آنکھیں کچھ زیادہ ہی تابناک لگ رہی تھیں۔ نورل کی ادھیڑعمر بیوی بھی آج برقعے میں لپٹی ہوئی تھی۔ شمیم نے بس پر سوار ہوتے ہوے اس کی طرف دیکھ کر اپنے ابرو سے ایک اشارہ کیا۔ نذیر اس اشارے کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔

تھوڑی دیر بعد جب انھوں نے ڈرائیور کو اپنی نشست پر بیٹھتے ہوے دیکھا تو وہ دونوں بھی اندر جا بیٹھے۔ بس جو کھڑی ہوئی بہت دیر سے کانپ رہی تھی، بالآخر اسٹان سے چل پڑی۔

پردہ دار عورتیں ڈرائیور کے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھی تھیں جبکہ نورل اور ٹیلی فون آپریٹر داہنی طرف کی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ نذیر سوچ رہا تھا کہ ہنگورجہ تک شمیم کا اسے اپنی گردن موڑ کر دیکھنا مشکل ہو گا۔ وہ حیدری سے اسی لیے اونچی آواز میں باتیں کرتا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی آواز شمیم تک پہنچتی رہے۔ وہ باربار پہلو بدلتے اس کے جسم کی بے چینی کو محسوس کر رہا تھا۔ دفعتاً اس کی نگاہ ڈرائیور کے سامنے لگے آئینوں پر جا کر ٹھہر گئی اور اس کی مسرت کی کوئی حد نہ رہی۔ سامنے لگے ہوے ہر آئینے میں اسے اس کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ نذیر کی آنکھیں ان آئینوں کے درمیان بھٹکنے لگیں۔

اس نے برقع پوش شمیم کو بھی ان آئینوں میں جھانکتے ہوے دیکھ لیا۔ ان دونوں کی نظریں آئینوں میں باہم ملنے لگیں۔ اس نے اپنے شوہر کی موجودگی کی پروا کیے بغیر اپنا نقاب ذرا سا الٹ دیا اور زیرِلب مسکراتی اپنے نوخیز عاشق کو مستی بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

نذیر بہت چوکنا بیٹھا تھا اس لیے اس نے کچھ ہی دیر میں بھانپ لیا کہ اس کا ٹیلی فون آپریٹر شوہر سفید چادر میں لپٹی ہوئی ایک لڑکی کی طرف متوجہ تھا۔

شمیم کی نشیلی آنکھوں میں گم خود اسے باہر سے گزرتے ہوے مقامات کا کوئی پتا نہ تھا۔ گول باڈی بس گرد اڑاتی سڑک پر چلتی رہی۔ اس کے اطراف میں کہیں گندم کا کھیت نظر آتا تو کہیں کماد کی فصل، کہیں لیموں تو کہیں کھجور کا باغ، اور کہیں کہیں سیم و تھور سے متاثرہ زمینیں بھی گزرتی جا رہی تھیں۔

سوا گھنٹے بعد وہ ہنگورجہ پہنچ گئے۔ یہ قصبہ سپر ہائی وے کے ساتھ ہی واقع تھا۔ اسٹاپ پر بس کے رکتے ہی سارے مسافر ذرا سی دیر میں نیچے اُترگئے۔ وہاں سے کوئی سواری سیدھی درازہ شریف نہیں جاتی تھی، اس لیے وہ لوگ مجبوراً سکھر جانے والی بس پرسوار ہو گئے جس نے انھیں رانی پور میں باب سچل سرمست کے قریب اتار دیا۔

وہاں سے ایک سوزوکی پر بیٹھ کر وہ درازہ پہنچے۔ شام ڈھلنے میں تھوڑی سی دیر باقی تھی، جب وہ سچل سرمست کے مزار کے احاطے میں داخل ہوے۔

مزار پر واقع مسجد میں لوگ مغرب کی نماز ادا کر رہے تھے۔ ہوا سے ہلتا، پھریرے کھاتا ہوا مزار کا سیاہ علم بہت بلندی پر قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ کشادہ اور وسیع لنگرگاہ میں ان قمقموں کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وضوخانے کے نلوں سے پانی بہنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لوگ مزار کے وسیع و عریض احاطے میں واقع قبروں پر فاتحہ پڑھتے اور لنگرگاہ کے فرش پر بیٹھ جاتے۔

حیدری اور نذیر مزار سے باہرٹھیلے والوں کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے اور چلغوزے خرید کر کھانے لگے۔ مزار پر پہنچتے ہی شمیم نے برقع اُتار دیا اور سر پر صرف چادر اوڑھ کر مسکراتے ہوے ان کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں اندر مزار کے احاطے کی طرف نہیں گئے۔ انھوں نے ٹیلی فون آپریٹر کے شک کو بھانپ لیا تھا۔ کسی بدمزگی سے بچنے کی خاطر انھوں نے فاصلے پر رہنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

وہ دونوں چلغوزے کھاتے ہوے باہر ہی ٹہلتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد نورل جوگی ان کے پاس آیا تو انھوں نے اس کے ہاتھ میں بھی کچھ چلغوزے تھما دیے اور مزار کے قریب سے گزرنے والی سڑک پر واقع ہوٹل کی طرف چل پڑے۔

کوٹھڑی نما ہوٹل لوگوں سے کھچاکھچ بھرا ہوا تھا۔ وہاں اندر وی سی آر پر کوئی پنجابی فلم چل رہی تھی۔ وہ دونوں باہر چولھے کے پاس بنچ پر بیٹھ گئے جبکہ حیدری پنجابی فلم دیکھنے ہوٹل کے اندر چلا گیا۔

نورل نذیر کے پاس بیٹھ کر ٹیلی فون آپریٹر کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکالتا رہا۔ نذیر کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے ہوٹل کے بیرے کے چائے کی پیالی لاتے ہی اس نے موضوع بدل دیا۔

پکوڑافروش اسے بتانے لگا کہ کھانے کے لنگر کے بعد محفلِ موسیقی شروع ہو گی جو صبح فجر سے پہلے تک جاری رہے گی۔ بےسُرے شوقین فنکار صبح تک عارفانہ کلام گائیں گے۔ ہو سکتا ہے ان کی گائیکی سے بیزار ہو کر ٹیلی فون آپریٹر رَلّی بچھا کر وہیں سو جائے، مگراس خبیث کا کچھ پتا نہیں، اگر اسے کوئی عورت بھا گئی تو حرامی رات بھرآنکھ نہیں جھپکے گا۔ خیر، چاہے کچھ بھی ہو جائے، اس کی بیوی شمیم کو لے کر قبرستان پہنچ جائے گی جہاں ان دونوں کو ملاقات میسر آ سکے گی۔

نذیرمطمئن ہو گیا کہ اس کا یہاں آنا اکارت نہیں جائے گا۔ اس نے سچل سرمست سائیں کی عظمت کا ذکر چھیڑ دیا اور نورل عقیدت سے اس کی باتیں سنتے ہوے اپنا سر دھننے لگا۔ بہت دیر تک وہ بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

جب اندر فلم ختم ہو گئی تو سب لوگ انگڑائیاں لیتے ہوے باہر نکلے۔ حیدری ٹھنڈی آہیں بھرتا ہوا آیا اور ان کے پاس بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ تینوں وہاں سے اٹھے اور ٹہلتے ہوے دوبارہ مزار تک آئے اور لنگرگاہ میں گھومنے لگے۔

ٹیلی فون آپریٹر نے ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوے نورل کو بلایا۔ اس نے رات میں بھی کالا چشمہ آنکھوں پر پہن رکھا تھا۔

نورل کے جانے کے بعد ان دونوں نے وضوخانے میں جا کر ہاتھ منھ دھویا اور اس کے بعد دونوں نے سچل کے مزار کے اندر جا کر فاتحہ خوانی کی۔ فاتحہ خوانی کر کے نکلے تو صحن میں شمیم برگد کے ایک گھنے پیڑ کے نیچے اپنے شوہر کے قریب بیٹھی ہوئی نورل کی بیوی سے باتیں کر رہی تھی۔ اسے دیکھنے کے لیے نذیر حیدری کے ساتھ کچھ دیر وہاں گھومتا رہا۔ وہ اسے اپنے گردوپیش منڈلاتے دیکھ کر لطف اندوز ہو رہی تھی۔ جب وہ ٹہلتا ہوا اس کے نزدیک سے گزرتا تو وہ مسکراہٹ سے اسے دیکھتی، اپنی آنکھوں کے کونوں سے اشارے کرتی اور اپنے شوہر سے نظر بچا کر ہاتھ بھی ہلاتی۔

لنگر شروع ہوتے ہی لنگرخانے میں دیگوں کے گرد لوگوں کا ہجوم جمع ہو گیا۔ مزار کے خلیفے اور مجاور زائرین کو صبر کی تاکید کرتے رہے۔ جسے مٹی کی تھالی میں اپنے حصے کا لنگر ملتا وہ وہاں سے دور جا بیٹھتا۔ حیدری نے ہمت کرتے ہوے ہجوم میں راستہ بنا کر لنگر حاصل کر لیا۔ مٹّی کی تھالی میں گرماگرم چاولوں نے انھیں بہت مزہ دیا۔ چاول ختم ہونے کے بعد وہ دونوں اپنی انگلیاں چاٹنے لگے۔

سماع گاہ میں فرش کی صفائی کے بعد کھلے صحن میں چٹائیاں بچھا دی گئیں۔ مقامی فنکار طبلے اور ہارمونیم سنبھالے اپنی مخصوص نشستوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ لنگر ختم ہونے کے بعد محفلِ سماع سے لطف اندوز ہونے والے بہت کم لوگ باقی رہ گئے تھے۔

کچھ ہی دیر میں پورے احاطے میں طبلے کی تھاپ اور ہارمونیم کے سُر پھیل گئے اور سب کے سب سروں کی کشش میں کھنچے سماع گاہ میں آ آ کر ڈیرہ ڈالنے لگے۔

نذیر شمیم سے بے خوف و خطر ہو کر ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ وہ یہاں کے اجنبی لوگوں سے ہرگز خوفزدہ نہیں تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہاں کا سارا اہتمام صرف اس کی ملاقات کے لیے کیا گیا ہے۔

رات ہولے ہولے دبے پاؤں گزر رہی تھی۔ کئی لوگ قوالی سنتے سنتے اپنی چٹائیوں پر ہی گہری نیند سو گئے اور بہت سے دھیرے دھیرے اٹھ اٹھ کر رخصت ہو گئے۔

ٹیلی فون آپریٹر بھی تھکاوٹ اور اکتاہٹ کی وجہ سے جماہی پر جماہی لے رہا تھا۔ شمیم نے اس کے لیے رلّی بچھائی۔ اس نے اپنی ٹوپی، چشمہ اور بٹوا اس کے حوالے کیا اور خود اجرک اوڑھ کر سو گیا۔

محفل سماع چل رہی تھی۔ بوڑھے قوال اپنا اپنا ہنر دکھا کر چلے گئے تو ہارمونیم اور طبلے پر نوخیز قوالوں کی اجارہ داری قائم ہو گئی۔ وہ اپنی محرومیوں اور ناآسودہ خواہشوں کا غبار چیخ چلّا کر نکالنے لگے۔

نذیر نے اِدھراُدھر نگاہ دوڑائی۔ سماع گاہ کے فرش پر لوگ یہاں وہاں بکھرے ہوے تھے۔ مسجد کے مینار اور محرابیں تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ مسجد سے متصل مزار کی اونچی اور سیاہ دیوار تھی۔ بہت دیر تک بیٹھے رہنے کی وجہ

سے نذیر کو بھی اونگھ سی آنے لگی تھی۔ نورل نے آ کر اسے جھنجھوڑا اور اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے اسے باہر چلنے کو کہا۔

نذیر اٹھ کر اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ سب ٹھیلے والے وہاں سے جا چکے تھے۔ نذیر لمبے سانس بھرتا سامنے واقع خالی ڈھنڈار میدان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہاں یکہ و تنہا کھجور کا درخت آسمان کے نیچے اپنے پنکھ پھیلائے کھڑا تھا۔ اس کے تنے کی کھردراہٹ اور میلی رنگت رات کی تاریکی کے سبب اوجھل ہو گئی تھی۔ اس کی ٹیڑھی میڑھی شباہت میں اسے عجیب حسن دکھائی دے رہا تھا۔ شاعرِ ہفت زبان کے مزار کے سامنے اسے رات کے اس پہر کھجور کا یہ درخت پرکشش محسوس ہو رہا تھا۔ نورل اسے اکیلا چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے شمیم کو نورل کے ساتھ آتے دیکھا تو اسے کھجور کے درخت کے لیے اپنے دل میں پیدا ہونے والی پسندیدگی کی حقیقت معلوم ہو گئی۔ شمیم اس وقت بھی سرتاپا برقعے میں لپٹی ہوئی تھی۔ نذیر نے اپنے جگری یار حیدری کو قبرستان کے باہر پہرے داری پر مامور کیا اور خود شمیم سے ذرا تسلی سے بیٹھ کر دو باتیں کرنے چلا گیا۔

اس مختصر سے قبرستان میں جابجا کیکر اور بوڑھ کے ٹنڈمنڈ درخت کھڑے تھے جن کے بیچ بہت سی چمگادڑیں اڑتی پھرتی تھیں۔ وقفے وقفے سے ان کی نوکیلی آواز گونجتی اور پورے قبرستان میں پھیل جاتی۔

وہ اس سے آگے احتیاط سے چل رہا تھا تاکہ کوئی ایسی جگہ ڈھونڈ سکے جہاں ان کا کچھ دیر بیٹھنا ممکن ہو۔ ”اس پراسرار ماحول سے شمیم کہیں خوفزدہ نہ ہو جائے،“ اس نے سوچا۔

پیڑوں کے بیچ چلتے ہوئے وہاں واقع ایک چھوٹے سے خستہ اور بوسیدہ مزار کی داہنی دیوار کے ساتھ انھیں کچھ جگہ مل گئی۔ اس نے اپنے جوتوں کی مدد سے وہ جگہ صاف کی اور آس پاس کی زمین پر اینٹوں کے ایسے ٹکڑے تلاش کرنے لگا جن پر تھوڑی دیر بیٹھا جا سکے۔

ایک سبک رو چمگادڑ شمیم کے کانوں کے قریب سے گزر گئی۔ چمگادڑ کو اپنے بہت قریب دیکھ کر اور اس کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سن کرشمیم دہشت زدہ ہو گئی اور اس کے منھ سے ایک زوردار چیخ نکلی۔ اس کی چیخ سن کر قبرستان کے باہر موجود پکوڑافروش دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے شمیم کی ہمت بندھانے کے لیے چند جملے کہے اور اس کے بعد واپس چلا گیا۔

نذیر اینٹوں کے ٹکڑوں کی تلاش میں کچھ دور نکل گیا تھا۔ وہ اینٹوں کے دو بڑے ٹکڑے اٹھائے واپس آیا تو شمیم تاریکی میں اسے بھی دیکھ کر سہم گئی۔ نذیر نے دیوار کے پاس اینٹوں کے ٹکڑے لگا کر بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔ شمیم اس کے ساتھ ہی ایک ٹکڑے پر بیٹھ گئی۔ وہ ابھی تک سہمی ہوئی تھی۔ چمگادڑ کے علاوہ وہ شاید قبرستان کے وحشت ناک ماحول سے بھی سراسیمہ لگ رہی تھی، اس لیے کچھ دیر گزرنے کے باوجود اس نے نذیر سے کوئی بات نہیں کی۔

نذیر نے دھیرے دھیرے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے شانے پر رکھ دیا اور اسے ہولے ہولے دبانے لگا۔ مردانہ ہاتھ کے بےصبر مگر اپنائیت بھرے لمس نے اسے خوف کی دلدل سے نکالا تو وہ اپنی بزدلی پر ندامت محسوس کرتی مسکرانے لگی۔

نذیر کا ہاتھ اس کے نرم کندھے سے ہوتا ہوا اس کے گداز بازو میں اتر گیا۔ شمیم کا ذہن بٹانے کے لیے اس نے پچھلی ملاقات کا ذکر چھیڑتے ہوئے اس کی جرأت اور بہادری کو سراہا۔ اس کی حوصلہ افزائی کی۔ نذیر سے اپنی تعریف سننا اسے اچھا لگ رہا تھا۔

وہ اسے آہستگی سے اپنی طرف کھینچتے ہوئے ہنس کر بولا، ”تم مجھ سے زیادہ اچھی طرح جانتی ہو کہ اگر تمھارے شوہر کے خاندان میں کسی کو ہمارے اس تعلق کے بارے میں ذرا سی بھنک بھی پڑ گئی تو ہم دونوں کو کاروکاری کر کے مار دیا جائے گا۔ ہم آگ کے دریا کے اوپر بندھی ہوئی باریک سی ڈوری پر چل رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم مجھ پر اپنے اعتماد کا اظہار کرتی رہیں تو ہم آگ کے دریا کے پار ضرور اتریں گے۔“ اس نے شمیم کی تابناک آنکھوں میں جھانکا۔ وہ اس کی بےباک نگاہوں کی تاب نہیں لا سکی اوراس نے اپنا سر جھکا لیا۔ وہ بھی اپنے دل کے منجمد دریا کو پگھلا نے والے اور اسے ایک پُرشور ندی میں تبدیل کرنے والے اپنے اس محسن کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی مگر نذیر کے ہاتھوں کی جنبش اسے بےخودی کی خواب آگیں وادیوں کی طرف لیے جا رہی تھی۔ لذت کا ست رنگا پرندہ اس کی پور پور میں دھیرے دھیرے اپنے پر پھیلانے لگا تھا۔

نذیر نے اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا، ”ہمارا آج کا یہ ملاپ ہمارے پیار کی یادگار ہے۔ میں اسے زندگی بھر بھول نہیں سکوں گا۔ آج حضرت سچل سرمست بھی ہمارے پیار کے گواہوں میں شامل ہو گئے۔“ اس کا ہاتھ اس کے بازو

کے گداز سے پھسل کر اس کے سینے کی گولائیوں کو ناپنے لگا۔ وہ اس کے اور نزدیک آ گیا۔ ’’دیکھو! تم گاؤں کی عورت ہو، اور تمھیں ڈرنا نہیں چاہیے۔ ‘‘

وہ مزاحمت کرنا چاہتی تھی مگر نذیر کے شریر ہاتھوں نے اس کے حواس معطل کر دیے تھے۔ اس کے بدن کے رگ و ریشے میں ایک بےچینی اور بےاطمینانی سی پھیلتی جا رہی تھی۔ وہ لذت کے ست رنگے پرندے کو اپنے بدن کی تمام پہنائیوں اور تمام وسعتوں میں مائل بہ پرواز دیکھنا چاہتی تھی۔ اس خواہش میں وہ اپنی ملاقات کا محل ِوقوع تک فراموش کر بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں خودبخود بند ہو رہی تھیں۔ اپنے بوجھل پپوٹے بمشکل پوری طرح کھول کر اس نے نذیر کی طرف دیکھا اور پہلی بار اپنے بازو پھیلا کر اسے اپنے بدن سے لپٹا لیا۔ نذیر کے تشنہ لبوں کا بوسہ لینے کے بعد اس نے بمشکل اسے اپنے آپ سے علیحدہ کر دیا۔ الگ ہونے کے بعد نذیر نے گردوپیش نظر دوڑائی تو اسے پہلی بار اس محلِ وقوع کی حرمت کا خیال آیا۔ شب کا نجانے کون سا پہر تھا اور وہ انسانی لاشوں کے مدفن میں اس وقت کیا کر رہا تھا!

اسے خاموش پا کر وہ سمجھی کہ شاید وہ برا مان گیا۔ وہ اس کا دھیان بٹانے کے لیے اپنے ٹیلی فون آپریٹر شوہر کے خلاف باتیں کرنے لگی۔ وہ اس کی باتوں کے بیچ بیچ میں اسے لقمہ دیتا، اپنا غبار نکالنے میں اس کی مدد کرتا رہا۔

اچانک قبرستان کے باہر سے پکوڑافروش کی پکار سنائی دی۔ وہ نذیر کا نام لے کر اسے بلا رہا تھا۔ نورل کی پکار سن کر وہ دونوں چونکے۔ شمیم فوراً اٹھ کر اپنے لباس کی شکنیں درست کرنے لگی۔ اس نے برقعے کا نقاب اچھی طرح کس کر باندھا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ تشنہ لذت کی عدم تکمیل سے پیدا ہونے والی اذیت کا بوجھ اٹھائے ہوے وہ دونوں نڈھال قدموں سے چلنے لگے۔

نذیر تلخ سانس بھرتا ہوا قبروں کو روندتا ہوا چل رہا تھا۔ قبرستان کے باہر پہنچنے پر حیدری نے اسے ٹیلی فون آپریٹر کے نیند سے جاگنے کی خبر سنائی تو وہ اپنی کامیابی پر زیرِلب مسکرانے لگا۔

شمیم نورل کے ساتھ لنگرگاہ کی طرف چل پڑی جبکہ نذیر حیدری کے ساتھ سڑک کی جانب۔

ٹھری میرواہ واپس پہنچنے کے بعد کچھ روز تک وہ دکان پر نہیں گیا۔ نجانے کیوں ایک جگہ بیٹھ کر کام کرنے کے خیال سے ہی اسے وحشت ہونے لگی تھی۔ مگر اس کے لیے سارا دن گھر پہ رہنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ چاچی خیرالنسا کے لیے اس کی آنکھوں سے حیا ختم ہو گئی تھی۔ وہ جب چولھے پر جھکتی تو وہ ڈھٹائی سے اس کے سینے کی طرف دیکھنے لگتا اور ٹکٹکی لگائے دیکھتا ہی رہتا۔

ایک شام وہ صحن میں پیڑھی پر بیٹھی وضو کرتے ہوے اپنی ایڑیوں کا میل اُتار رہی تھی۔ بےدھیانی میں اس نے اپنی شلوار گھٹنوں تک کھینچ لی تھی۔ نذیر کو انھیں تاکنے کا موقع مل گیا۔ اس کی پنڈلیاں اسے بہت گداز محسوس ہوئیں۔ چاچی نے معاً اس کی طرف دیکھا تو اس کی بےحیا نظروں سے جھینپ کے رہ گئی اور فوراً اُٹھ کر جانماز پر نماز کی نیت باندھ کر کھڑی ہو گئی۔

وہ انتظار میں رہنے لگا تھا کہ وہ اسے چارپائی پر سوئی ہوئی نظر آ جائے۔ ایسے میں اس کی قمیض ذرا سی کھسک جاتی تھی اور اس کا لو دیتا بدن جھانکنے لگتا تھا۔

اگر کبھی اسے غسل خانے میں چاچی کے لٹکے ہوے ریشمی کپڑے مل جاتے، وہ ان کی ملائمت محسوس کرنے کی خاطر انھیں اپنی انگلیوں کی پوروں سے چھوتا اور اپنے ہونٹوں سے لگا کر چومتا۔

اس کے لیے چاچی سے گفتگو کرنا مزید مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ اس سے باتیں کرتے ہوے اچانک اس کی نظریں اس کے بدن پر بھٹکنے لگ جاتی تھیں۔ وہ اس کے گداز بھرے بھرے بازو کو دیکھنے لگتا تو خودبخود اس کی زبان میں لکنت پیدا ہو جاتی۔ اسے موقع محل کے مطابق مناسب لفظ نہ سوجھتا اور وہ جملوں کو توڑ کر بچوں کی طرح بولنا شروع کر دیتا۔

ایک بار وہ دیر تک پورے انہماک اور سنجیدگی کے ساتھ اس سے دست درازی کرنے کے متعلق سوچتا رہا مگر ایسا کرنے کی وہ اپنے اندر ہمت محسوس نہیں کر سکا۔ اسے لگتا تھا کہ چاچی جان بوجھ کر اس کی آنکھوں کے لیے منظر بناتی تھی لیکن اس کی بےلگام آنکھوں کو برداشت بھی نہیں کر پاتی تھی۔ اس کا لگاتار دیکھنا بھی اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ جلد ہی بیزار ہو جاتی اور اس کے چہرے پر تنفر اور بیزاری کے آثار پیدا ہو جاتے اور وہ فوراً اپنا جسم ڈھانپنا شروع کر دیتی۔ کئی مرتبہ اس نے اس کی بےمعنی سی بڑبڑاہٹ بھی سنی تھی۔ اس عورت کے سامنے دل کھولنا آسان نہیں تھا۔

وہ سوچتا، دوری کے اس سراب کے درمیان قرب کا دھوکا شاید ختم ہو جائے۔ وہ دونوں جہاں پر تھے، کیا پتا آنے والے دنوں میں اس سے اور زیادہ پیچھے چلے جائیں۔

چاچی خیرالنسا کے وجود سے اٹا یہ مکان اکثر اسے کاٹنے لگتا۔ اس لیے وہ صبح سویرے گھر سے نکل جاتا اور شام کو واپس لوٹتا۔ وہ شمیم سے دوبارہ ملنا چاہتا تھا۔ ملاقات کا ڈول ڈالنے کی اس نے پوری کوشش کی مگر اس کے کسی بھی پیغام کا مثبت جواب نہیں آیا۔ جب اس نے پکوڑافروش سے اس کی وجہ جاننی چاہی تواس نے بتایا کہ وہ عورت ذات ہے، تھوڑابہت نخرہ تو کرے گی۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس رات کے پچھلے پہر درازہ شریف کے قبرستان کا ماحول بہت خوفناک تھا۔ شاید اس پر کوئی اثر ہو گیا ہو اور کسی آسیب یا سائے کی وجہ سے وہ اس سے ملنے سے گریز کرنے لگی ہو۔

نذیر نے نورل کی اس بات کو من گھڑت سمجھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس رات کے بعداب شمیم اس سے اپنا تعلق ختم کرنا چاہتی ہے۔ وہ حیران تھا کہ اس سے ملنے کی خاطر دو مرتبہ خطرہ مول لینے کے بعد وہ اب کیونکر محتاط ہو گئی تھی۔ دوسرے رقیب کا خدشہ بھی خارج از امکان نہیں تھا یا پھر ہو سکتا ہے کہ اس کے ٹیلی فون آپریٹر شوہر کے کان میں ان کے پیار کی بھنک پڑ گئی تھی۔

اسے نورل پر بھی شک ہونے لگا تھا کہ اس نے اس کے شوہر سے مل کر سازباز نہ کر لی ہو یا نذیر سے دوستی کی آڑ میں اس کے لیے بھڑوت گیری کرنے سے وہ بیزار نہ ہو گیا ہو۔ مگر شاید اس کا خیال غلط تھا کیونکہ پکوڑافروش ویسے کا ویسا ہی تھا۔ وہ اب اس سے روپے بھی نہیں لیتا تھا۔

ایک مرتبہ اسے یہ اذیت ناک خیال آیا کہ شمیم سے ملاقاتوں میں دونوں مرتبہ وہ اپنی بھرپور مردانیت کا مظاہرہ نہیں کر سکا تھا۔ اسی لیے وہ اس سے روٹھ گئی اور اس کے حصے میں چند بوسوں کے علاوہ کچھ نہیں آ سکا۔ وہ چند بوسے اسے بہت ناکافی محسوس ہو رہے تھے۔ وہ اس کے وصل کی پوری لذت سے بہرہ یاب ہونا چاہتا تھا۔

شمیم کے ہجر کے ان روزوشب میں وہ خود کو زیادہ اکیلا محسوس کرنے لگا تھا۔ حیدری مذاق کے طور پر اسے جو طعنے دیتا اور جو پھبتیاں کستا، وہ اس کی تکلیف کو مزید بڑھا دیتیں۔ وہ سمجھنے لگتا کہ اپنی کم ہمتی اور ناتجربہ کاری کے سبب اس نے خود کو ایک شادی شدہ عورت کی نظروں میں بےوقعت ظاہر کر دیا تھا، اسی لیے اب وہ اس سے ملنے سے گریز کر رہی تھی۔

کچھ نئی عادتیں اور نئے مشغلے بھی اس کی اذیت کو کم نہیں کر سکے۔ اگرچہ قصبے کی ساری گلیاں اور سارے مکان اس کے دیکھے بھالے تھے، اس کے باوجود وہ بہت سا وقت آوارہ گردی میں گزارنے لگا۔ اس دوران راستے میں اسے کوئی لڑکی یا برقع پوش عورت نظر آتی تو وہ اس کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیتا۔ وہ خاتون یا لڑکی جس مکان میں داخل ہوتی وہ اس کے دروازے پر ٹکٹکی لگائے اس گلی میں کھڑا ہو جاتا اور خوامخواہ اس مکان کی دیواروں کے رخنوں اور دروازے کی درزوں سے جھانکنے لگتا۔ کبھی کبھار کوئی آدمی اس کی اس حرکت کا برا منا کر اسے للکارتا تو وہ فوراً وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا۔

قصبے کی دکانوں پر ویڈیو گیم اور کیرم بورڈ، ڈبو اور بلیئرڈ کھیل کھیل کر اس کی طبیعت اب ان سے بھی سیر ہو گئی تھی۔

وہ شمیم کے نرم و لذیذ لمس اور بوسوں کو فراموش کرنا چاہتا تھا۔ جب تک اس نے اس کے شوہر کو نہ دیکھا تھا، تب تک وہ اپنی تصوراتی دنیا میں خود کو اس کے پرشباب اور پرلطف جسم کا اکلوتا مالک سمجھتا تھا، مگر اب ٹیلی فون آپریٹرایک ایسی حقیقت بن کر سامنے آ چکا تھا اس کے لیے جسے جھٹلانا ناممکن تھا۔

وہ یہ سوچ کر کڑھتا رہتا اور دل ہی دل میں تاؤ کھاتا رہتا کہ وہ ٹیڑھا بینگا شخص اس جسم کا یکہ و تنہا مختار تھا۔ وہ اس کے نکاح میں داخل تھی۔ اس کے روزوشب اس شخص کی خاطرمدارات میں بسر ہو رہے تھے۔ وہ جب چاہتا، اس سے خلوت میں وصل کی لذت سے ہمکنار ہو سکتا تھا۔ نذیر کے لیے سب سے کربناک بات یہی تھی۔ یہ ہر وقت اس کے ذہن پر مسلط رہتی تھی اور اس کے لیے اس سے نجات پانا ممکن نہیں تھا۔ جب بھی ان خیالات کی اذیت ناکی حد سے بڑھنے لگتی تو وہ دانت کچکچانے لگتا، بےبسی سے اپنی مٹھیاں بھینچتا اور ہیجانی انداز میں زیرلب بڑبڑاتا۔ ’’وہ گھرے سرور سے بھری ہوئی ایک صراحیِ مے ہے جو پوری کی پوری اس کڈھب آدمی کی دسترس میں ہے۔‘‘

اس پر یہ مجنونانہ کیفیت عارضی طاری ہوتی۔ جب وہ اس کیفیت سے باہر آتا تو سکون کے لمحوں میں اپنے آپ کو سمجھانے لگتا۔ اس کی زندگی میں وہ پہلی عورت تھی جس نے اس کے غیرسنجیدہ رومان کا جواب پورے خلوص اور سنجیدگی سے دیا تھا۔ وہ اس رات صرف اس کی خاطر اپنے گھر، اپنے شوہر، اپنے گرم بستر اور لحاف کو چھوڑ کر اس سے ملنے آئی تھی۔ وہ اس کی دست درازی اور اس کی بوسہ بازی کو برداشت کرتی رہی تھی۔ وہ ہرگز کوئی فاحشہ نہیں تھی اور نہ ہی قیمتی چیزوں پر مرنے والی تھی۔ شاید اسے محبت کی ضرورت تھی، اور وہ اس کی یہ ضرورت پوری کرنے کو تیار تھا۔ اس نے اپنی بےلگام جسمانی خواہشوں کو ملعون و مطعون قرار دیا۔

کیا وہ پردہ نشین شمیم کے لیے اپنے دل میں محبت محسوس کرنے لگا تھا؟ اس کے لیے اپنے بدن میں اٹھتے طوفانوں اور ہیجانوں کو محبت قرار دینا بہت مشکل تھا۔ یہ کوئی اور ہی چیز تھی، محبت سے بھی زیادہ گہری، پراسرار اور عمیق چیز۔

بہت سوچ بچار کے بعد بالآخراس نے فیصلہ کیا کہ شمیم کو ایک آخری تحفہ بھجوائے۔ ہو سکتا ہے، تحفہ پا کراس کے دل میں امڈ کر ہیجان برپا کرنے کے بعد یخ بستہ ہونے والے اس کے پرجوش جذبات کی پرانی رو ایک مرتبہ پھر عود کر آئے۔ یہی خیال ذہن میں لا کر وہ رحیم سنار کے پاس گیا جو قصبے کا پرانا اور مشہور زرگر تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید زیور کی بدولت اس سے دوبارہ ملنے کی سبیل نکل آئے۔

زیورات کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ زرگر گلی میں واقع میلے شوکیسوں والی ایک دکان میں داخل ہوا تو اپنے کام میں مصروف بوڑھے سنار نے اپنا سر اٹھا کر ٹوہ لینے والی آنکھوں سے اسے دیکھنے کے بعد، مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ میں پکڑا جلتا ہوا دِیا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑا زیور ایک طرف رکھ دیا اور اپنے نوجوان گاہک کی طرف متوجہ ہوا۔

نذیر میلی کچیلی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا، ”میں نے آپ کے کام کی بہت دھوم سنی ہے۔ مجھے آپ سے ایک چھوٹا سا زیور بنوانا ہے۔ “

اپنی تعریف سن کر بوڑھا زرگر ہنسا، پھر اپنی موٹے شیشوں والی عینک کو اپنی میلی قمیض سے صاف کرتے ہوئے بولا، ”عزت اور ذلت دینا میرے رب سائیں کا کام ہے، میرا کام صرف محنت کرنا ہے۔“

نذیر نے اس سے ہار بنانے کی فرمائش کرتے ہوئے کہا کہ ہار بےشک چاندی کا بنا ہوا ہو مگر پہلی نظر میں دیکھنے پر وہ سونے کا معلوم ہونا چاہیے۔ اس کی چمک اتنی جلدی ماند نہ پڑے اور اس کی قیمت بھی بہت زیادہ نہ ہو۔

نذیر کی باتیں سن کر رحیم سنار کو اس کے دل تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

”یہ کام تو میرے بائیں ہاتھ کا ہے۔ مگر میں اس کے پیسے ایڈوانس لوں گا۔“

نذیر نے مطلوبہ رقم زرگر کے حوالے کی تو وہ کہنے لگا کہ پرسوں آ کر وہ اپنا ہار لے جائے۔ نذیر دکان سے مطمئن ہو کر نکلا۔

نذیر کی دکان سے لگاتار غیرحاضری پر چاچا غفور یہی سمجھتا رہا کہ اب تک اس کے بھتیجے کی صحت بہتر نہیں ہے۔ وہ ہر روز نذیر کو گھر میں سوتا ہوا چھوڑ کر اکیلا ہی دکان پر جاتا رہا۔ جب دکان سے اس کی غیرحاضری طول پکڑنے لگی تو چاچے کے دل میں شبہات سر اٹھانے لگے۔ اس نے ان شبہات کو کچل کر دل سے نکالنے کی بہت کوشش کی، مگر ان کی خودسری بڑھنے لگی۔ اس نے یعقوب کاریگر کو اپنے اندیشوں میں شریک نہیں کیا۔ سُبکی کے خوف سے پہلی بار اس نے کاریگر سے کوئی بات چھپائی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید وہ اس کا مذاق اڑاتا اور اس کے لیے زندگی بھر کے لیے کوئی پھبتی ایجاد کر لیتا۔ اسی خوف کے سبب اس نے اسے شاملِ راز نہیں کیا۔

جب اس کے دل میں پہلے شک نے رینگتے ہوئے جگہ بنائی تو وہ بہت جزبز ہوا تھا اور اس نے اسے پوری شدت سے رد کرنے کی کوشش کی تھی، مگر وہ کانٹے کی طرح اس کے دل میں پیوست ہو گیا تھا۔ اس نے خود کو ملامت کی تھی کہ اس کا بھتیجا ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔ وہ اسے اچھی طرح جانتا تھا۔

روزانہ گھر سے نکلتے وقت وہ برآمدے میں کھاٹ پر بےسدھ سوئے نذیر کو گھور کر دیکھتا۔ اس وقت اسے محسوس ہوتا کہ وہ رضائی کے نیچے آنکھیں کھول کر لیٹا ہو گا اور اس کے گھر سے جانے کا انتظار کر رہا ہو گا۔ بوڑھا درزی ایسے خیالات کو جھٹکنے کے لیے باربار اپنا سر ہلانے لگتا، اور گھر کی دہلیز سے نکلتے وقت اس کا دل ڈوبنے لگ جاتا۔ گلی میں چلتے ہوے باربار اس کے قدم ٹھٹک کر رک جاتے۔ وہ مڑ کر لمحہ بھر کے لیے سوچتا مگر گھر لوٹنے سے گریز کرتا۔

دکان پر تمام دن وہ اسی ادھیڑبن میں مبتلا رہتا۔ شام کو جب واپس لوٹتا تو گھر کے کونوں کھدروں میں جھانکتا پھرتا، جیسے کوئی ثبوت تلاش کرنا چاہتا ہو۔ وہ باتوں کے دوران اپنی بیوی کو کرید کر بھتیجے کے رویے اور اس کی عادتوں کے متعلق پوچھتا رہتا۔

چاچی خیرالنسا کے گمان میں نہیں تھا کہ اس کے ذہن میں کیسے خیالات رینگ رہے تھے۔ اس کی ذہنی حالت سے بےبہرہ، وہ عام سے انداز میں اسے دن بھر کی مصروفیات کا احوال سنا دیتی۔ اس کی باتیں سنتے ہوے چاچا اس کے چہرے کو گہری نظروں سے گھورتا رہتا۔ پھر مایوس، کوئی خاص بات معلوم نہ کر سکنے کے دکھ میں مبتلا ہو کر وہ ٹھنڈے سانس بھرنے لگتا اور اپنے ایک ہاتھ کی مٹھی کو دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مارتا رہتا۔

نذیر چاچے غفور کے بدلتے تیوروں اور رویوں پر حیران تھا۔ اب وہ نذیر سے کم ہی بات کرتا تھا اور اکثراوقات ٹوہ لینے والی نظروں سے اسے گھورتا رہتا تھا۔ نذیر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔

ایک روز دوپہر کو اچانک کام روک کر وہ یعقوب کاریگر سے بہانہ بنا کر دکان سے نکلا۔ وہ پُرامید جوش میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنی گلی میں داخل ہوا۔ مگر جوں جوں گھر کے قریب پہنچنے لگا، اس کے اوسان خطا ہونے لگے۔ کچھ اور آگے جا کر اس کا سر چکرایا اور پاؤں ڈگمگائے مگر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ وہ گھر کے دروازے تک پہنچا اور کچھ دیر تک کان لگائے وہاں کھڑا رہا مگر اسے اندر سے کوئی آواز نہیں سنائی دی۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ یہاں سے اندر داخل ہوا تو وہ لوگ اس کے قدموں کی چاپ سن لیں گے۔ وہ برسوں سے مقفل دروازے پر گیا جس کا راستہ دوسری گلی سے تھا جو ایک بند گلی تھی۔ وہ وہاں کھڑا بند گلی کو دیکھتا رہا۔ اس کے گھر کی پرانی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ پہلی بار دروازے پر چڑھنے کی کوشش کرتے ہوے وہ پیٹھ کے بل گلی کے کنارے پر بنی ہوئی نالی میں گرتے گرتے بچا۔ دوسری مرتبہ اس نے دروازے پر مضبوطی سے پیر جمایا اور کنڈی کے لوہے کو زور سے پکڑ کر گھر کے پچھلے حصے میں کود گیا۔ غسل خانے کی طرف سے کپڑے دھونے کی دھپ دھپ سن کر اسے سخت مایوسی ہوئی۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ اس جانب سے گھر میں داخل ہوا تو وہ اسے دیکھ کر پریشان ہو جائے گی۔ وہ چپکے سے دبے پاؤں واپس چلا گیا، مگر شک کا کانٹا کسی طور اس کے دل سے نہیں نکل سکا۔

شام کو دکان سے واپس آنے کے بعد اس نے دبے لفظوں میں نذیر سے دکان پر نہ آنے کی شکایت کی تو ندامت محسوس کرتے ہوے اس نے اگلے دن دکان پر جانے کا وعدہ کر لیا۔

اگلی صبح وہ دکان جانے کے لیے تیار ہو کر گھر سے نکلا، مگر اس کے قدم اسے بہکا کر میرواہ کے کنارے واقع چائے خانے پر لے گئےجہاں اس کی مڈبھیڑ نورل سے ہو گئی۔ اس کے ہمراہ چرس پینے کے بعد دکان جانے کا خیال اس کے ذہن سے نکل گیا۔ اس نے چاچے غفور کی نافرمانی کی اور مزید کچھ روز تک جان بوجھ کر دکان نہیں گیا۔ چاچے نے اپنے بھتیجے کی ہٹ دھرمی دیکھتے ہوے اسے دوبارہ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔

چاچا غفور نہیں چاہتا تھا کہ اس حوالے سے کوئی بھی بات نکل کر مشہور ہو جائے۔ وہ خاندان بھر میں اپنی بدنامی سے خوفزدہ تھا۔ اس لیے اس نے اپنے بھتیجے پر دھونس نہیں جمائی، اسے ڈانٹا ڈپٹا نہیں۔

اس نے میرپور ماتھیلو میں رہنے والے اپنے بڑے بھائی سے ایک مرتبہ نذیر کو اس کے پاس بھیجنے کے لیے کہا تھا۔ اس لیے وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس نے گالم گلوچ کر کے اسے نکال دیا تو اس کی بہت جگ ہنسائی ہو گی اور پوری برادری میں اس کی ناک ہمیشہ کے لیے کٹ جائے گی۔

شام کی آوارہ گردی کے دوران ایک گلی میں اس کی مڈبھیڑ نورل سے ہو گئی۔ اس نے نذیر کو ایک ایک حیران کن مگر خوشی سے لبریز خبر سنائی۔ کچھ دیر پہلے ہی نذیر نے زرگر کی دکان پر جا کر اس سے ہار وصول کیا تھا۔ ہار کے بارے میں پکوڑافروش کو بتانے سے پہلے ہی اس نے اسے مژدۂ جاں فزا سنا دیا۔

نذیر وہ بات سن کر اس پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے تو سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی عورت اتنی جرأت مند اور دلاور بھی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے شوہر کے گھر میں اپنے عاشق کو ملاقات کے لیے دعوت دے دے۔ خوشی

میں اس نے بےاختیار ہو کر نورل کے کھردرے گالوں کو چوم لیا اور اس کی بےترتیب مونچھوں کو تھپتھپانے لگا۔ اس کے بعد شام بھر وہ پکوڑافروش کو ساتھ لیے مختلف چائے خانوں میں گھومتا پھرا۔ اس نے نورل کو خوش کرنے کے لیے پچاس روپے کا نوٹ زبردستی اس کی جیب میں ڈال دیا۔ اس نے ہار والی بات جان بوجھ کر اس سے پوشیدہ رکھی مبادا اس کے دل میں حرص پیدا ہو جائے اور وہ اپنی بیوی کے ذریعے مسرتوں بھری آئندہ ملاقات میں کھنڈت ڈال دے۔ رات نو بجے کے آس پاس اس نے اسے میرواہ کے پل پر خدا حافظ کہا۔

صبح کو عجیب واقعہ رونما ہوا۔ نذیر گہرے خوابوں میں گم مزے کی نیند سو رہا تھا۔ غفور چاچا غصے میں بپھرا ہوا برآمدے میں آیا اور اس نے بلند آواز میں مخاطب کرتے ہوے اسے شانوں سے جھنجھوڑ کر جگایا۔ اس نے بڑبڑاتے ہوے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے آج پہلی بار چادر میں لپٹے ہوے اپنے چاچا کو غیظ وغضب کے عالم میں دیکھا۔ اس کے چہرے پر شدید تناؤتھا۔ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور غصے کی شدت سے اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔

نذیر چارپائی پر اٹھ کر بیٹھا تو بوڑھے درزی نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ اسے گریبان سے پکڑ کر اس کے چہرے اور سینے پر زوردار مکے رسید کرنے لگا۔

ایسی بےموقع پٹائی کے بارے میں نذیر نے سوچا بھی نہیں تھا۔ دو چار لمحوں تک وہ اپنے جسم پر چاچے کے زوردار گھونسوں کی ضربیں برداشت کرتا رہا۔ اس نے آس پاس نگاہ دوڑائی مگرچاچی خیرالنسا اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ اس نے اپنے ہاتھ اور منھ سے جواب دینے کے بجاے خود کو بچانا ہی مناسب سمجھا۔

وہ چاچے کی کرخت اور فحش گالیوں کا جواب اپنے مسکین سوالوں سے دیتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ لاچار اٹھا اور وہ بوڑھے درزی کو دھکا دیتا ہوا صحن کی طرف بھاگ نکلا۔ اس کے دھکے سے چاچا غفور فرش پر گر گیا اور ہانپتا ہوا اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

چاچی خیرالنسا غسل خانے سے باہر آئی تو اس نے پہلے نذیر کی طرف اور پھر اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر تک وہ سمجھ ہی نہیں پائی کہ ان دونوں کے درمیان کیا چل رہا ہے۔ چاچا ایک مرتبہ پھر نذیر پر حملہ کرنے کے لیے اس کی طرف لپکا تو اسے چاچی نے روک لیا اور اسے سمجھاتی ہوئی زبردستی کمرے میں لے گئی مگر اس کے منھ سے لگاتار گالیاں سنائی دیتی رہیں۔

نذیر نے چاچے کی غصے بھری بڑبڑاہٹ سے اندازہ لگا لیا تھا کہ بوڑھے زرگر نے کل شام نے اس کے پاس جا کر اسے ہار کے متعلق بتا دیا تھا جو اس نے اسے بنا کر دیا تھا۔ اس نے زیرِلب اس رذیل سنار کو جی بھر کر گالیاں دیں۔

غسل خانے میں ہاتھ منھ دھونے کے بعد وہ چائے پینے کے لیے باورچی خانے میں جا کر بیٹھ گیا تاکہ چاچا کی غضب ناک آنکھوں سے دور رہ سکے۔ پتیلی میں موجود چائے کو چھان کر اس نے پیالی میں ڈالا اور بلند آہنگ سڑپے لے کر چائے پیتے ہوے باربار دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔

اس کے ذہن میں خیالات کی رو چل رہی تھی۔ آج رات اسے شمیم سے ملنے جانا تھا اور صبح سویرے ایسی بدمزگی کا رونما ہونا اسے اچھا شگون نہیں لگ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ غفور چاچا کے دل میں اس کے لیے جو نفرت بھر گئی ہے کسی طرح سے وہ ختم ہو جائے۔

وہ باربار سوچ کر خود کو تیار کر رہا تھا کہ کچھ بھی ہو وہ جوگیوں کے گوٹھ ضرور جائے گا۔ اس نے کئی مرتبہ شلوار کی جیب میں رکھے ہار کو ٹٹول کر اس کی موجودگی کو محسوس کیا۔

باورچی خانے کی طرف آتے ہوے قدموں کی آہٹ سن کر وہ چونکا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو چاچی خیرالنسا کو آتے دیکھ کر اسے اطمینان ہوا۔

چولھے کے قریب بیٹھتے ہوے اس نے نذیر کو گہری نظر سے دیکھا۔ اس کی جھکی ہوئی نگاہ اور جھکا ہوا سر دیکھ کر چاچی کے چہرے پر تمسخرآلود تاثر نمایاں ہونے لگا۔ اس سے کوئی بات کیے بغیر اس کے منھ سے ہونہہ کی آواز نکلی۔ نذیر نے یہ آواز سنتے ہی اس کا مطلب سمجھ لیا۔ وہ صبح ہونے والی اپنی پٹائی کی وجہ سے اس کے سامنے عجیب سی خفت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے خالی پیالے کو ایک بار پھر چائے سے بھر لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی موضوع پر اس سے بات چیت شروع ہو مگر وہ پہل کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ وہ سر جھکائے صرف اس کے سانسوں کی آواز سنتا رہا۔

خاموشی میں اس کے سانسوں کی آواز نے اسے چاچی خیرالنسا کے اس وقت کے محسوسات کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا۔ بےدھیانی میں چسکی لیتے ہوے چائے کا گھونٹ اچانک اس کی سانس کی نالی میں چلا گیا۔ وہ اتنے زور سے کھانسا اور چھینکا کہ اس کے حلق اور ناک سے نکلتے چائے کے ذرّے چاچی کے کپڑوں پر جا گرے۔ اس کا ہاتھ کانپا اور چائے کا پیالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر چاچی بےساختہ ہنسنے لگی۔ اس نے زمین پر پڑے ہوے اوندھے پیالے کو سیدھا کر دیا، کیونکہ اوندھی پڑی ہوئی چیزیں اس کے خیال میں بدشگونی کی علامت ہوتی تھیں۔

ایسے حساس ترین موقعے پر اس کا ہنسنا نذیر کو ناگوار محسوس ہوا۔ اس نے نزدیک ہی رکھے ہوے گھڑے سے پانی نکال کر منھ اور ناک صاف کیا۔

چاچی کچھ دیر تک اسے کریدنے والی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ پھرکسی تمہید کے بغیر اس سے پوچھنے لگی، ’’تم نے وہ ہار آخرکس لیے بنوایا تھا؟‘‘

’’کون سا ہار؟‘‘ وہ خود کو سنبھالتے ہوے صاف مکر گیا۔

’’وہی جو تم نے رحیم سنار سے بنوایا تھا؟‘‘

’’کیا یہ بات سنار نے خود چاچے کو بتائی ہے؟‘‘ نذیر اس قضیے کے ماخذ تک پہنچنا چاہتا تھا۔

’’ہاں! اسی نے تیرے چاچے کو بتایا ہے۔ ‘‘ وہ اس کی طرف دیکھتی اس کی دلی کیفیت کو آنکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

’’میں نے وہ ہار...‘‘ وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اچانک اسے ایک اور خیال سجھائی دیا اور اس نے بغیر سوچے بےدھڑک کہہ دیا، ’’میں نے... وہ ہار... تیرے لیے بنوایا تھا۔ میں وہ تجھے دینا چاہتا تھا۔ مگر کل رات وہ میری جیب سے کہیں گر گیا۔‘‘ اپنی جرأتِ اظہار پر وہ خود حیران تھا۔

’’میرے لیے؟‘‘ اس کی بات سن کر اس کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ ’’مگر میرے لیے کیوں؟‘‘

’’ اس لیے کہ کچھ دن پہلے جب میں بیمار ہوا تھا تو تُو نے میری بہت خدمت کی تھی،‘‘ وہ معصومیت سے بولا۔

چاچی اسے گھورتی رہی، پھر جھرجھری لیتے ہوے بولی، ’’اپنے چاچا کو مت بتانا، ورنہ وہ ہم دونوں کو جان سے مار دے گا۔‘‘ اس نے سہمی نظر سے دروازے کی طرف دیکھا۔

’’میں نے سوچ لیا ہے کہ اسے کیا بتانا ہے۔‘‘

بےیقینی سے اس کی طرف دیکھنے کے بعد وہ ناشتے کی تیاری میں مصروف ہو گئی جبکہ وہ وہیں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ جب ناشتہ تیار ہو چکا تو وہ اسے اپنے ساتھ غفور کے کمرے میں لے گئی۔

چاچے کے تیور اب تک ویسے ہی تھے۔ اس کے ماتھے پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ انھیں کمرے میں آتے دیکھ کر اس نے اپنا منھ دوسری طرف پھیر لیا۔

’’رحیم سنار کی بات سچی ہے یا نہیں؟‘‘ اس نے تحکم آمیز لہجے میں اس سے سوال کیا۔

’’اس کی بات میں سچائی ہے، مگر میں نے وہ ہار حیدری کے کہنے پر بنوایا تھا۔‘‘

’’حیدری کے کہنے پر؟ وہ کیوں؟‘‘

’’اس کا کسی لڑکی کے ساتھ کوئی چکر ہے،‘‘ نذیر نے بتایا۔

اس کا جواب سن کر چاچے کے لبوں پر خودبخود مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”اچھا، اس کا چکر ہے! کہیں تمھارا بھی کوئی چکر تو نہیں ہے؟“

اس نے سنجیدگی سے جواب دیا، ”نہیں چاچا۔“

وہ ہنستے ہوے اپنی بیوی کو دیکھنے لگا جو پائینتی بیٹھی ہوئی تھی۔

چاچے کا مزاج بدلتا دیکھ کر نذیر کے علاوہ چاچی نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔

ناشتہ کرتے ہوے نذیر کو اپنی کوتاہی کا احساس ہو گیا۔ اسے دکان کی طرف سے تغافل نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میرپور ماتھیلو سے شہربدر ہوتے ہوے اس کے والد نے اسے نصیحت کی تھی کہ ٹھری میرواہ جا کر درزی کے کام میں دل لگانا۔ آدمی کے پاس کوئی ہنر ہو تو اس کی زندگی آسان ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے چاچا کے پاس کام کرنے آیا تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے دکان سے اپنی غیرحاضری کے حوالے سے وہ اس کی تشفی نہیں کر سکا تھا۔ اس کے چھوٹے موٹے بہانے زیادہ عرصے تک کارآمد نہیں ہو سکتے تھے۔ اسی لیے سنار کی بات سن کر وہ غصے سے لال بھبھوکا ہو کر اس پر برس پڑا تھا۔ چاچا کے غصے میں بھرے ہوے سرخ چہرے میں نذیر کو اپنے والد کی جھلک دکھائی دی تھی۔

چاچا غفور سے تعلقات میں کشیدگی ختم کرنے کے لیے اس نے دکان پر وقت گزارنے کا فیصلہ کیا تاکہ اگر آج رات کسی نے اس کا خالی بستر دیکھ لیا تو وہ اس پر مچنے والے ممکنہ فساد کو دبانے میں کامیاب ہو سکے گا۔ نجانے کیوں اس کے دل کو دھڑکا لگا ہوا تھا کہ آج کی شب اس کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آنے والا ہے۔

چاچی خیرالنسا ناشتے کے برتن اٹھانے کے لیے جھکی تو وہ خود کو اس کے سینے کی لکیر دیکھنے سے باز نہیں رکھ سکا۔ ”کیا یہ اس نے مجھ پر ایک اور مہربانی کی ہے؟“ وہ یہ سوچتا ہوا دکان جانے کے لیے اٹھا۔

وہ دکان پر پہنچا تو وہاں چاچا کو نہ پا کر سخت حیران ہوا۔ اس کے سوال پوچھنے پر یعقوب کاریگر نے اسے بتایا کہ وہ کسی کام سے رانی پور گیا ہوا ہے۔ اس نے اپنی پریشانی ظاہر کی کہ اس کا دوست پچھلے کچھ دنوں سے کسی ادھیڑبن میں مبتلا ہے۔ اب اس کی ہنسی پہلے کی طرح بےساختہ نہیں رہی تھی اور باتیں کرتے کرتے وہ اچانک کہیں کھو سا جاتا تھا۔ بہت پوچھنے اور کریدنے کے باوجود اس نے اپنی الجھن کے بارے میں اسے نہیں بتایا۔ بتاتے بتاتے اس نے اپنی سلائی مشین روک دی اور کرسی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوے اس نے بیڑی سلگائی اور بات کا سلسلہ وہیں سے دوبارہ شروع کیا۔ ”میں یہ سمجھا کہ وہ کام کی وجہ سے پریشان ہے مگر وہ گھبرانے والا آدمی بھی نہیں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے وہ دکان سے تمھاری غیرحاضری پر کڑھتا ہو، لیکن یہ بات مجھ سے چھپانے والی تو نہیں۔ کچھ اور ہی معاملہ لگتا ہے۔“ اس نے چٹکی بجا کر اپنی بیڑی کی راکھ فرش پر جھٹکی۔

نذیر اب تک محویت سے اس کی باتیں سنتا رہا تھا۔ وہ اس کیفیت سے نکل کر، اس کے قریب جا کر رازداری سے کہنے لگا، ”چاچا غفور پہلے ایسا نہیں تھا۔ آج تو اس نے رحیم سنار والی بات پر صبح صبح میری دھنائی کر دی۔“

یہ سن کر کاریگر داڑھی کھجا کر زور سے ہنسنے لگا۔ ”مجھے کل ہی لگ رہا تھا کہ وہ گھر جا کر تمھیں نہیں چھوڑے گا۔ میں نے کل اسے بہت سمجھایا تھا کہ جوانی میں ہر آدمی دل لگی کرتا ہے۔ بلکہ اس نے خود کیا کچھ نہیں کیا، اور ابھی تک کرتا پھر رہا ہے۔“

”یعقوب، مذاق مت کرو۔ چاچا ایسا آدمی نہیں،“ وہ ہچکچاتے ہوے بولا۔

”ارے تمھیں کیا معلوم! وہ تو شادی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ اسے ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے لڑکپن میں ہی لیڈیز کپڑوں کا کام سیکھ لیا تھا اور اس زمانے میں تو عورتیں بھی گھروں سے کم ہی نکلتی تھیں۔ غفور کا باتیں کرنے کا انداز اتنا میٹھا ہوتا تھا کہ جو عورت اس کے ساتھ ایک یا دو مرتبہ بات کر لیتی، وہ اسی وقت اس کے شیشے میں اتر جاتی۔ جب کبھی وہ کسی کے کپڑے پہنچانے اس کے گھر جاتا تو دروازے پر ہی دو تین جملوں میں اس نازنین کا دل جیت لیتا۔ اس کی بےشمار راتیں گلیوں میں بھاگتے، دیواریں پھلانگتے اور معشوقائوں کے گھروں کی چھتیں ٹاپتے گزرتی تھی۔ کبھی اس کی کسی محبوبہ کا بھائی تو کبھی کسی کا شوہر یا باپ نیند سے اٹھ جاتا۔ ہر بار وہ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر اپنی جان بچا کر بھاگ نکلا۔ صرف ایک مرتبہ وہ بہت بڑے طریقے سے پھنس گیا تھا اور اسے پورا ہفتہ حوالات میں گزارنا پڑا تھا۔ ہوا یہ کہ میروں کے محلے میں ایک درزی تھا سائیں بخش۔ تین سال پہلے وہ مر گیا۔ غفور اس کی دکان پر کام کرتا تھا۔ دکان کی چابیاں ہمیشہ اسی کے پاس ہوتی تھیں۔ دکان والی گلی میں ایک بیوہ رہتی

تھی۔ وہ غفور پر جان دیتی تھی۔ ایک شام اس نے بیوہ کو دکان پر بلوا لیا اور دکان کا شٹر گرا کر اس سے ملنے لگا۔ کسی نے بیوہ کو اندر گھستے ہوے دیکھ لیا تھا، جس کی وجہ سے باہر شور مچ گیا۔ شٹر اٹھا تو لوگوں نے بیوہ کو تو جانے دیا مگر تمھارے چاچے کو تھانے میں بند کروا دیا۔ ” یعقوب کاریگر یہ باتیں سنانے کے بعد ہنسی میں لوٹنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اسے محسوس ہوا کہ اس نے اس کے بھتیجے کو کچھ زیادہ ہی بتا دیا۔ یہ سوچ کراس نے فوراً سنجیدگی اختیار کر لی۔

نذیر اس کی باتیں سن کر بہت محظوظ ہوا۔

’’وہ میرا استاد ہے، مگر اب اسے خداجانے کیا ہوا ہے، وہ مرجھاتا جا رہا ہے، ‘‘ وہ افسردہ ہو کر بولا۔

کاریگر کے خاموش ہوتے ہی نذیر اپنی نشست پر جا بیٹھا اور پھر سے سلائی کے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کے بعد سارا دن انھوں نے کوئی خاص بات نہیں کی۔

شام سے ذرا پہلے غفور چاچا بکھرے ہوے بالوں اور گرد میں اٹے ہوے چہرے کے ساتھ دکان میں داخل ہوا۔ اپنی تھکاوٹ اور اضطراب چھپانے کے لیے اس نے ہنس کر ان سے دو چار باتیں کیں۔ یعقوب کاریگر نے اس سے رانی پور جانے کا سبب پوچھا تو اسے ٹالنے کے لیے اس نے گول مول جواب دے دیا۔ نذیر کو پتا چل گیا کہ وہ اس سے جھوٹ بول رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ چاچا غفور سے اجازت لے کر دکان سے چلا گیا۔

نذیر شام ڈھلنے سے کچھ دیر پہلے نہر کنارے واقع چائے خانے پر پہنچا تو وہاں پکوڑافروش کو اپنا منتظر پایا۔ وہ چائے پینے کا خواہشمند تھا مگر نورل نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔

وہ تاریک گلیوں میں چلتے ہوے قصبے کے شمال میں واقع ایک مے خانے میں پہنچے۔ نذیر اچھی طرح جانتا تھا کہ اندرون سِندھ کے بیشتر گوٹھوں اور قصبوں میں ایسے مے خانے عموماً مزاروں اور درگاہوں کا حصہ ہوتے ہیں، مگر قابلِ تعظیم سادات گھرانے کے معتقدین کی بڑی تعداد نے پنجتن پاک سے منسوب مخصوص نشان سے آراستہ بڑے بڑے سیاہ علم لگا کرمختلف جگہوں پر ایسے مے خانے قائم کر رکھے ہیں۔ یہاں چرس اور بھنگ کے موالیوں کا ڈیرہ رہتا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ یہاں آنے والے ہر خاص وعام کی تواضع بھنگ اور چرس سے کی جاتی ہے۔ یہاں سادات گھرانے سے تعلق رکھنے والوں کے علاوہ لاہوتیوں کو خاص احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ مے خانے عموماً کسی قسم کی شان و شوکت اور آرائش سے بےنیاز ہوتے ہیں۔ موالی نشے کی جھونجھ میں سادات گھرانے کی قربانی، ان کے ساتھ ہونے والے مظالم، ان سے منسوب کرامات اور معجزات کا ذکر بڑھ چڑھ کر کرتے ہیں۔

وہ دونوں دروازے سے بےنیاز مختصر سے احاطے میں داخل ہوے جس کے اطراف دیواروں کے بجاے سوکھی شاخوں اور جھاڑیوں کی باڑھ تھی۔ یہاں کی زمین کچی مگر ہموارتھی۔ احاطے کے بیچوں بیچ مٹی کے چبوترے پر نصب ایک موٹے سے بانس پر سیاہ علم لگا تھا، جس پر پنجتن پاک کی نسبت سے مخصوص پنجے کی شکل کا نشان بنا ہوا تھا۔ اس کے اوپر ایک بلب روشن تھا، جس کی پھیکی سی روشنی میں ہوا سے لہراتا ہوا علم دکھائی دے رہا تھا۔ نیچے چبوترے پر دو چراغ جل رہے تھے جن کی لویں ہوا کے جھونکوں سے لرز رہی تھیں۔

احاطے کے ایک کونے میں گھاس پھوس کی ایک جھونپڑی سے باربار موالیوں کے نعرے بلند ہوتے سنائی دے رہے تھے۔ جھونپڑی میں داخل ہوتے ہی نورل نے بھی نعرۂ حیدری بلند کر کے اپنی آمد کا اعلان کیا۔ کشادہ سی جھونپڑی کے عین وسط میں چھوٹے سے گول دائرے میں آگ کا مختصر سا الاؤ روشن تھا جس کے گرد پندرہ بیس موالی حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ ان کے قریب ہی ان دونوں کو زمین پر بچھی پیال پر بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔ اس وقت وہاں چرس کی سلفی کا دور چل رہا تھا اور پوری جھونپڑی چرس کے دھویں اور بو سے بھری ہوئی تھی۔

موالیوں نے آس پاس ہٹ کر انھیں الاؤ کے قریب ہو کر بیٹھنے کے لیے جگہ دی۔ نذیر نے جیب سے پچاس روپے نکال کر ایک موالی کو دیے اور اسے بھنگ اور چرس لانے کے لیے کہا۔ وہاں بیٹھے موالی اس کی سخاوت سے متاثر ہوے اور نورل سے پوچھ پوچھ کر تعارف حاصل کرنے لگے۔ نذیر عام طور پر زیادہ گفتگو نہیں کرتا تھا مگر ان بیکار لوگوں کے بیچ بےدھڑک بولنے لگا۔

الاؤ کے گرد بیٹھے لوگوں کے چہرے نشے کی کثرت سے سوجے ہوے تھے اور ان کی آنکھیں گہری سرخ ہو رہی تھیں۔ نذیر کے تعارف کے بعد وہ سب ایک دوسرے پر تصوف کی جھوٹی سچی باتیں جھاڑنے لگے۔ ہر آدمی زیارتوں اور مزاروں کے قصے سنا رہا تھا، جن سے نذیر کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وقفے وقفے سے کسی درگاہ کا کوئی بھولابھٹکا درویش ادھر آ نکلتا تو مے خانے کی رونق اور بڑھ جاتی۔

نذیر نے اپنے نشے کی حد سے تجاوز کرتے ہوے بھنگ کے دو گلاس چڑھائے اور گاہے بگاہے چرس کی سلفی کے کش بھی کھینچتا رہا۔ اسے خود پر اعتماد تھا کہ نشے کی زیادتی کے باوجود نہیں بہکے گا۔ جب اس نے بہت زیادہ نشہ کر لیا تو اس کے دل میں کسی سے بھی بات کرنے کی خواہش یکسر ختم ہو گئی۔ الاؤ کے گرد بیٹھے ملنگوں کی بےسروپا لن ترانیوں پر وہ باربار اپنا سر دھنتا رہا۔ دھیرے دھیرےاس کی سماعت کے در بند ہونے لگے اور وہ ان کی آوازوں سے دور ہوتا چلا گیا۔ وہ یوں ہی خالی خالی نظروں سے موالیوں کے چہروں کو دیکھنے لگا۔ الاؤ کی مچلتی اور تلملاتی لپٹوں کی روشنی میں وہ سب کے سب اسے اس وقت بدروحوں جیسے معلوم ہونے لگے تھے۔ ان کے چہروں کی تمام سرخی ان کی آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔

جھونپڑی سے باہر گہری رات پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی نظر جھونپڑی میں داخل ہونے کے لیے بنے چوکھٹے پر ٹھیر گئی۔ آسمان پر ٹمٹماتے ہوے تارے اسے صاف دکھائی دیے۔ اس نے ایک حواس باختہ شخص کو زور سے زمین پر پاؤں پٹختے ہوے دیکھا اور ایک جھرجھری سی لی۔ ذرا فاصلے پر نورل جوگی بیٹھا تھا۔ نذیر نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے اسے چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ اپنے کپڑے جھاڑتا ہوا پیال سے اٹھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر مے خانے کے موالیوں کو اللہ وائی کہا اور ڈگمگاتے ہوے قدموں سے جھونپڑی سے باہر چلا گیا۔

وہ دونوں لہراتے ہوے آہستگی سے قدم اٹھاتے ہوے گلیوں میں چلنے لگے۔ رات کا پہلا پہر ابھی ختم نہ ہوا تھا مگر قصبے کی گلیوں اور سڑکوں سے زندگی رخصت ہو گئی تھی۔ لیکن نذیر کو شب کے تیسرے پہرکا شدت سے انتظار تھا۔ وہ مضطرب تھا مگر اس نے رستے بھر نورل سے کوئی بات نہ کی۔ وہ باربار اپنے تخیل میں ایک دیہاتی حویلی کی خوابگاہ میں حجاب سے بےنیاز شمیم کے بدن کے مہین خدوخال دیکھ رہا تھا، جو بےقراری سے وہاں اس کی منتظر تھی۔ وہ اس کے ساتھ اپنی گزشتہ بےڈھب ملاقاتوں کو یاد کرتا رہا۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیوں کی پوریں اس کے اعضاے بدن کے لمس، اور اس کے ہونٹ اس کے لبوں کے نرم گرم بوسوں کے لیے مچل رہے تھے۔ اس کے گزشتہ لمس اور پرانے بوسوں میں لذت و سرور سے زیادہ افسوس اور تشنگی شامل تھی۔

گلیوں سے گزرتے ہوے نورل اسے مختلف نصیحتیں کرتا رہا۔ ”اس کے گھر پہنچنے کے لیے گاؤں کے اندرونی راستوں سے جانا تمھارے لیے ٹھیک نہیں ہو گا۔ اس نے جو بندوبست کیا ہے اس سے لگتا ہے وہ ذہین عورت ہے۔ اس لیے اس نے تمھاری آمد کے لیے پچھلے راستے کو چنا۔ اور دیکھو! اگر کوئی گڑبڑ ہو جائے تو تم اسی راستے سے باہر نکلنا۔ مولا مشکل کشا تمھاری مدد کرے گا۔ “

”نورل! اب مجھے وہاں جانے سے کوئی خوف نہیں،“ نذیر نے اعتماد سے کہا۔

پکوڑافروش نے چلتے چلتے جماہی لی۔ ”مگر یاد رکھنا! کسی کے گھر میں گھس کر اس کی عورت سے ملنا اتنا آسان نہیں۔“

اپنے گھر والی گلی کے کونے پر پہنچ کر ہاتھ ملاتے ہوے اس نے نورل سے کہا، ”تم اسی پرانی جگہ پر میرا انتظار کرنا۔ میں بالکل ٹھیک وقت پر پہنچ جاؤں گا۔“

دروازے میں ہاتھ ڈال کر کنڈی کھول کر وہ گھر میں داخل ہوا اور ہولے ہولے چلتا ہوا برآمدے میں اپنی چارپائی تک پہنچا۔

چاچی خیرالنسا نے شاید اس کی آہٹ سن لی تھی، وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ چاچا غفورکے خرّاٹے برآمدے میں نذیر کو بھی سنائی دے رہے تھے۔

اسے دیکھ کر نذیر حیران ہوا مگر اپنی حیرت چھپاتے ہوے کہنے لگا، ”میں نے دروازے پر کنڈی لگا دی ہے۔ معاف کرنا میری وجہ سے تیری نیند ٹوٹ گئی۔ تو دوبارہ جا کر سو جا۔ میں خود ہی روٹی نکال کر کھا لوں گا۔“

خیرالنسا نے اپنے چہرے سے بال ہٹاتے اور سر پر چادر اوڑھتے ہوے کہا، ”میں نے تیرے لیے آج روٹی نہیں پکائی، اور سالن بھی تو گرم کرنا ہو گا۔“

یہ بات یکسر خلافِ معمول تھی اس لیے اسے شدید حیرت ہوئی، لیکن وہ چپ سادھے رہا۔ وہ جماہی لیتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

نذیر نے برآمدے کا بلب روشن کر دیا اور دوبارہ آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور وہاں سے بیٹھے بیٹھے کمرے میں جھانک کر چاچے کی طرف سے ایک بار پھر اطمینان کرنے لگا۔ پھر وہ اٹھ کر غسل خانے میں جا کر ہاتھ منھ دھونے لگا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ چاچی کو اس کے نشے کے بارے میں کچھ معلوم ہو۔

وہ دھیرے دھیرے چلتا باورچی خانے میں داخل ہوا اور چولھے کے پاس رکھی پیڑھی پر جا بیٹھا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا: ”ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ میں جب سے یہاں آیا ہوں، تُو میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ تُو میری دور کی رشتےدار بھی نہیں لگتی۔ جو میرے رشتےدار ہیں، وہ سب کے سب مجھے گالیاں دیتے ہیں۔ میرپور ماتھیلو میں تھا تو وہاں ابا اور بھائی مجھے گالیاں دیتے تھے۔ اور یہاں پر میرا چاچا دیتا ہے۔ میں نے اچھی طرح سوچ لیا ہے کہ تھوڑے ہی دن میں ٹھری میرواہ بھی چھوڑ کر چلا جاؤں گا، اور کسی ایسی جگہ جاؤں گا جہاں سے کسی کو میری کوئی خبر نہیں مل سکے گی۔ آخر مجھے تو ہی بتا، کیا میں بہت خراب ہوں؟ کیا میں واقعی بہت برا شخص ہوں؟“ کہتے کہتے وہ اچانک خاموش ہو گیا۔

اس کے کہے ہوے جملوں نے چاچی کے دل پر بہت اثر کیا۔ وہ اس کے لیے پہلے سے جو ہمدردی محسوس کر رہی تھی اس کی یہ باتیں سن کر اس میں اضافہ ہو گیا۔ آج کا تمام دن اس نے نذیر کے بارے میں سوچتے ہوے گزارا تھا۔ اس نے پہلی بار اپنے ذہن میں اس کے لیے ابھرنے والی جذبات کی رو کو دبایا نہیں تھا۔ اپنے شوہر کے نامناسب طرزِعمل پر وہ اسے جی ہی جی میں ملامت کرتی رہی تھی اور اسے مسترد کرتی رہی تھی۔ وہ بھی چاہتی تھی کہ نذیر سے صرف ایک بار ہی سہی مگر کھل کر بات کرے۔

اس نے اندازہ لگا رکھا تھا کہ شاید وہ اس سے کبھی کوئی بات نہ کرے، کیونکہ وہ اس کے گھر میں مہمان کی حیثیت سے رہتا تھا اور ان کے رشتے کی نوعیت بھی بےحد حساس تھی۔ اس نے سوچ کر خود سے ہی طے کر لیا تھا کہ بات کرنے میں وہ پہل کرے گی۔ نذیر کی اس کے لیے دلچسپی کے متعلق اسے اب پورا یقین ہو چکا تھا۔ وہ اس بات کا بخوبی اندازہ لگا چکی تھی کہ وہ ہار اب بھی اسی کے پاس تھا اور وہ موقع محل دیکھ کر اسے دینا چاہتا تھا مگر صبح کو پیش آنے والے واقعے کی وجہ سے اس نے جھوٹ بول دیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنے لیے بنوایا جانے والا ہاردیکھے اور اسے اپنے گلے میں سجائے۔

مگر... اس کے ہونٹوں سے ٹھری میرواہ چھوڑ کر جانے کی بات سن کر وہ دھک سے رہ گئی تھی۔ اس کی افسردگی دیکھ کر وہ بھی آزردہ خاطر ہو گئی تھی۔ کاش وہ اسے بانہوں میں بھر سکتی اور اس کے لبوں کو چوم چوم کر اس کا غم اپنے اندر جذب کر سکتی۔

وہ کسمساتے ہوے بولی، ”دیکھ! تیرے چاچے کو بدگمانی اور غلط فہمی ہو گئی تھی، مگر تُو نے اس کا شک دور کر کے اسے مطمئن کر دیا۔ میں نے بھی اس سے بہت کچھ کہا سنا۔ اس کے بارے میں ایک بات میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ دل کا بُرا نہیں ہے۔ تم اسے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے، ورنہ وہ ٹھری میرواہ میں اکیلا رہ جائے گا۔ “

نذیر غور سے اس کی طرف دیکھتا اس کی باتیں سنتا رہا۔

چاچی خیرالنسا نے مزید کہا، ”میں اپنی شادی سے پہلے تمھاری رشتےدار نہیں تھی مگر اب تیری چاچی لگتی ہوں۔ اگر تم میری عزت کرتے ہو تو میرواہ چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔ نہیں جاؤ گے نا؟“

وہ جواب میں کچھ نہیں بولا۔ اپنا سرجھکائے چپ چاپ روٹی کا نوالہ چباتا رہا۔

وہ نذیر سے مثبت جواب سننا چاہتی تھی مگر اس کی خاموشی سے تلملا کر رہ گئی۔

”میں اسے اچھی طرح سمجھاؤں گی۔ آج کے بعد وہ تجھے کچھ نہیں کہے گا،“ وہ پیڑھی پر بیٹھی بیٹھی پہلو بدل کر بولی۔

”بس چاچی، میں نے فیصلہ کر لیا ہے!“ نذیر نے حتمی بات کہہ دی۔

اس کی خموشی کو اس کا اٹل فیصلہ سمجھ کر چاچی خیرالنسا چپ ہو گئی اور اذیت بھرے سانس لینے لگی۔

نذیر نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تو وہاں اسے کرب کی خفیف سی لہر دکھائی دی۔

وہ رہ رہ کر سوچ رہی تھی کہ اس کے جانے کے بعد کیا ہو گا۔ اس کے بغیر اپنے بنجر ماہ و سال کا خیال اسے بہت ہولناک محسوس ہو رہا تھا۔ زندگی پھر ویسی ویران اور بےمزہ ہو جائے گی جیسی کہ پہلے تھی۔

نذیر دل ہی دل میں سوچ رہا تھا: ”یہ آخر رات کے اس پہر یہاں کیوں بیٹھی ہے؟ اپنے کمرے میں جا کر سو کیوں نہیں جاتی؟“

خیرالنسا نے دونوں بازو پھیلا کر انگڑائی لی تو وہ خود کو اس کے سینے کے پرکشش ابھار دیکھنے سے نہیں روک سکا۔ وہ ہٹ دھرمی سے اس کے بدن کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کی رانوں سے چپکی ہوئی شلوار اور اس کے ابھرے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر اسے محسوس ہوا کہ وہ اگر چاہے توصرف لمحے بھر میں اس سے ہمکنار ہو سکتا تھا۔ شاید وہ اسی خاطر وہ اب تک یہاں بیٹھی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ جھرجھری سی لیتی ہوئی اس سے پوچھنے لگی، ”کیا تُو واقعی ہمیشہ کے لیے میرواہ سے چلا جائے گا؟“

نذیر اس کی تشویش پر مسکراتے ہوئے اٹھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے باورچی خانے کے دروازے تک گیا۔ وہ اس کی مسکراہٹ اور اس کے اٹھ کر جانے کو نہیں سمجھ سکی۔ وہ دو لمحوں تک باہر جھانکنے کے بعد پلٹ آیا اور اس کے نزدیک آ کھڑا ہوا۔ ”نہیں جاؤں گا۔ میں یہاں سے کبھی نہیں جاؤں گا۔ اور وہ بھی صرف تیری خاطر۔ “

اس کا جواب سن کر وہ ضبط کی کوشش کے باوجود ہنسنے لگی۔ ”تو مجھے تنگ کرنے کے لیے یہ بات کر رہا تھا۔ جانتی ہوں تجھے!“

نذیر اس کے قدموں کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس نے اس کے ہاتھ تھام لیے اور انھیں بےطرح چومنے لگا۔ اپنے ہاتھوں پر اس کے بوسوں کو محسوس کر کے وہ لرز کر رہ گئی۔ اس کے وجود پر چڑھا ہوا کوئی پرانا میل اتر رہا تھا اور اس کے بدلے اس کے وجود پر ایک انوکھا اور منفرد رنگ چڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر کے لیے کبوتر کی طرح آنکھیں میچ لیں۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ اسے ہلکا سا دھکا دے کر اپنے ہاتھ چھڑا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

دھکا لگنے سے وہ لڑکھڑا گیا۔ مگر اگلے ہی لمحے سنبھل کر تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے خیرالنسا کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ دونوں کے بدن کچھ دیر کے لیے ایک وجود معلوم ہونے لگے۔ وہ اس کے شانے کو چومتا ہوا اس کے چہرے تک پہنچا اور والہانہ انداز سے اس کے ہونٹوں پر بوسہ باری کرنے لگا۔ وہ اسے خود سے الگ کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

نذیر نے اس کی سماعت میں شیریں سی سرگوشی کرتے ہوئے کہا، ”میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ تم بہت اچھی ہو۔“

وہ اس کے بوسوں کا جواب دینے کے بجائے کسمسا رہی تھی اور دھیرے دھیرے کہہ رہی تھی: ”وہ جاگ جائے گا۔ وہ جاگ گیا تو بہت برا ہو گا۔ میں جاتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے نذیر کو اپنے آپ سے الگ کیا اور تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد وہ باورچی خانے میں کھڑا کچھ دیر تک اپنی بپھری ہوئی سانسیں درست کرتا رہا۔ پھر وہ جا کر برآمدے میں کھاٹ پر لیٹ گیا۔

لیٹے لیٹے وہ حیرت سے مسکرایا، پھر آہستگی سے ہنسنے لگا۔ وہ حیران تھا کہ اتنی بڑی انہونی آخر کیسے ہو گئی؟ مگر جو کچھ بھی ہوا وہ اچانک اور اس کے کسی ارادے کے بغیر ہوا تھا۔ اس نے اس کی دست درازی کا بڑا نہیں مانا۔ اس نے کسی خفگی کا اظہار بھی نہیں کیا۔ اپنی اس غیرمتوقع کامیابی پر خوش ہوتے ہوئے اس نے اندھیرے میں اپنے ہاتھوں کو دیکھا اور انھیں اپنے ہونٹوں کے پاس لے جا کر چومتے ہوئے ان میں چھپے لمس کو محسوس کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے سوچا کہ اس کی زندگی میں چند اور خوشگوار لمحوں کا اضافہ ہو گیا۔ وہ مدت سے ایسی عورت کی تلاش میں سرگرداں تھا جو چند لمحوں کے لیے سہی، اس کے لیے اپنے جسم کی آغوش وا کر دے۔ وہ مستقبل سے وابستہ اپنی توقعات کے بارے میں سوچ سوچ کر لذت کشید کرنے لگا۔

آج کی رات اس کی زندگی کی سب سے خوش نصیب رات تھی۔ دو طرف سے اس پر لطف و کرم کی پھوار گرنے لگی تھی۔ یہ پھواراس کے بےقرار اعضائے بدن کو قرار دے رہی تھی۔ وہ چارپائی سے اتر کر صحن میں آ گیا۔ اس کی نگاہ اٹھ

کر آسمان پر گئی اور وہاں چمکتے ہوئے ستاروں پر بھٹکتی رہی۔ ہر ستارہ اسے آج خوشی کا چراغ معلوم ہو رہا تھا۔ اس کا رنگ، اس کی چمک گویا کسی شادمانی کا اظہار کر رہی تھی۔ اس نے اس گھر کے درودیوار سے ملحقہ مکانوں کے ابھرے ہوئے نوکدار سایوں کو دیکھا۔ رات کے اس پہر ہر مکان خاموشی اور تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور تمام کھڑکیاں اور روشندان بند تھے۔

ٹہلتے ٹہلتے اسے چاچے غفور کا خیال آیا۔ وہ اس کی لاعلمی پر دھیرے دھیرے ہنسنے لگا، مگر اگلے ہی لمحے خود کو ملامت کرتے ہوئے اس عجیب وغریب انتقام پر حیران ہو گیا۔ اس نے اپنے دل میں چاچے کے لیے ہمدردی محسوس کی۔ اس نے گناہ کے شدید احساس کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کی۔ خود کو سمجھایا کہ یہ سارا معاملہ اس کی مرضی کے بغیر خودبخود طے ہوا ہے۔ اس نے اس راز کے کھلنے کی صورت میں اپنے لیے منتظر بدنامی اور ذلت کے بارے میں سوچا تو اس کے جی میں آیا کہ اسی وقت دروازہ کھول کر کمرے کے اندر گھس جائے اور بوڑھے درزی کو ہلاک کر دے۔

جوگیوں کے گوٹھ جانے کا خیال کچھ وقت کے لیے اس کے ذہن سے محو ہو گیا تھا۔ اسے شمیم یاد آئی تو چونک پڑا۔ اس نے گھڑی پر وقت دیکھا۔ ابھی اس کے گھر سے نکلنے میں پون گھنٹہ باقی تھا۔ پچھلی مرتبہ کی طرح اس بار بھی یہ سفر اسے دشوارگذار معلوم ہو رہا تھا لیکن وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے لیے یہ سفر ناگزیر ہو چکا ہے۔

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ چارپائی سے اٹھا اور پہلے کی طرح اپنے تکیے کو رضائی کے نیچے رکھ کر اسے اس کے اوپر بچھا دیا۔ چپل پہن کر وہ دھیرے دھیرے دروازے کی طرف بڑھا۔ دہلیز پار کرنے کے بعد اس نے باہر سے دروازے پر کنڈی لگائی اور چل پڑا۔ وہ محتاط انداز میں دبے پاؤں چلتا ہوا مختلف گلیوں سے گزرا۔ اس نے مختلف جگہوں پر تعینات چوکیداروں کی سیٹیوں کو سنا تو اس کے حوصلے خطا ہونے لگے۔ ایک گلی میں داخل ہوتے ہی آپس میں گتھم گتھا دو آوارہ کتے اچانک اس کے سامنے آ گئے۔ اس کی سانسیں لمحہ بھر کے لیے ساکت ہو گئیں۔ ان کی چیخوں میں وحشت کے ساتھ ساتھ دہشت بھی تھی۔

ابھی بمشکل آدھا راستہ طے ہوا تھا۔ وہ چلتے ہوئے چاروں سمتوں میں باربار دیکھتا رہا۔ جوں جوں راستہ کٹ رہا تھا، اس کے قدموں میں ایک عجیب سی ڈگمگاہٹ آتی جا رہی تھی۔ اسے اپنے پورے وجود میں ڈر پھیلتا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک بجلی کے کھمبے کے سائے سے خوف کھا کر اس نے لوٹ جانے کے بارے میں سوچا۔ چلتے چلتے وہ ٹھٹک کر رکا، مگر پھر دھیمی رفتار سے آگے بڑھنے لگا۔

اسے باربار یہ خیال ستا رہا تھا کہ کسی لمحے کوئی شخص اچانک اسے پکڑ لے گا اور چور یا ڈاکو سمجھ کر پولیس اسٹیشن لے جائے گا۔ وہ ہر مکان کے دروازے کو غور سے دیکھتا ہوا گزر رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اچانک سب کے سب مکانوں کے دروازے بھک سے کھل جائیں گے اور وہاں سے اچانک بہت سے لوگ باہر نکلیں گے اور اسے ہلاک کر ڈالیں گے۔ اس نے خود کو ملامت کی کہ آج کی شب اس نے بھنگ اور چرس کا استعمال ضرورت سے کچھ زیادہ ہی کر لیا۔ اسی وجہ سے اس کا ذہن واہموں اور وسوسوں سے بھر گیا تھا۔ ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے وہ تیزرفتاری سے چلنے لگا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا تو اسے حیرت ہوئی۔ اسے اپنے گھر سے خوش باش نظر آنے والے ستارے یکسر تبدیل ہو گئے تھے اور آنکھیں مچمچاتے ہوئے اسے کینہ توز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اسے لگ رہا تھا، زمیں و آسمان کے تمام مظاہر اور مناظر آج کی رات اس کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے۔

وہ نہر کے کنارے پہنچا تو سردی کا احساس شدت اختیار کر گیا، مگر آج وہ سویٹرکے اوپر جرسی پہن کر آیا تھا۔ اس کے گلے میں مفلر بھی تھا۔ اس کے باوجود درختوں کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ ٹھنڈ سے کپکپانے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے نہر کے پل تک پہنچا۔ یہاں ہر چیز دھند میں اٹی ہوئی تھی اور کہرا پڑ رہا تھا۔ پل کے نیچے سے گزرتا پانی مدھم سی سرگوشیاں کرتا بہہ رہا تھا۔ اس نے پل کی دیوار پر اپنا ہاتھ رکھا تو اس کا ہاتھ گیلا ہو گیا۔ پل سے نیچے اترنے سے پہلے اس نے رک کر گردوپیش کے منظر پر نظر دوڑائی۔ گہری تاریکی کے باوجود ایک مدھم سی روشنی سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ پل سے نیچے اتر کر وہ کچھ دیر کچی سڑک پر چلتا رہا۔ اس کے بعد داہنے ہاتھ پر واقع کھیتوں کے اندرگھس گیا اور گیلی گھاس پر پاؤں جما کر چلنے لگا۔ کچھ آگے جا کر وہ ٹھہر گیا اور پکوڑافروش کو آوازدینے لگا۔ اس نے آس پاس بہت غور سے دیکھا۔ اسے نہ کہیں سے اٹھتا ہوا دھواں نظر آیا اور نہ ہی فضا میں چرس کی خوشبو محسوس ہوئی۔ وہ ہاتھ سے جھاڑیوں کو ٹٹولتا رہا مگر نورل اسے کہیں بھی نہیں ملا۔

اس نے انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے اسے پُل آسانی سے دکھائی دے۔ بہت وقت گزرنے کے بعد بھی کوئی نہیں آیا۔ وہ مخمصے میں تھا۔ اسے اپنے دوست سے اس بات کی توقع نہیں تھی۔ وہ اس پر ہمیشہ اندھا اعتماد کرتا رہا تھا۔

ملاقات کے لیے مقررہ وقت میں تھوڑی دیر باقی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ ہو سکتا ہے شمیم نے اس کے لیے دروازہ کھول دیا ہو، مگر رہ رہ کر اسے پکوڑافروش کی دغابازی تنگ کر رہی تھی۔ اس کے بغیر وہ خود کو بےآسرا اور بےبس محسوس کر رہا تھا۔ وہ گومگو کے عالم میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ پچھلی بار بھی وہ اسی کے سہارے وہاں تک چلا گیا تھا، مگر آج وہاں تک جانا اسے پُرخطرمحسوس ہو رہا تھا۔ اس کا ذہن اسے باربار وہاں سے چلے جانے کے لیے کہہ رہا تھا مگر اس کا دل اس کے قدم روکے ہوئے تھا۔ رہ رہ کر اسے شمیم کا مخملیں بدن یاد آ رہا تھا۔ اس کی یاد کی کشش خودبخود اس کے قدموں کو اپنی طرف کھینچنے لگی۔

وہ چاروں طرف سے کماد کی فصل میں گھرا ہوا تھا۔ اِدھراُدھر نظر ڈالنے پر اسے ایک پگڈنڈی دکھائی دینے لگی اور وہ اس پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ کچھ آگے جا کر وہ فصل سے باہر نکلا۔ احتیاط سے آس پاس دیکھتے ہوئے اس نے گوٹھ کی جانب جانے والا راستہ عبور کیا اور اس طرف کھڑی فصل کے اندر چلا گیا۔ فصل کے درمیان چلتے چلتے اسے پانی کی قلقاریاں سنائی دینے لگیں۔ پانی کا نالا قریب ہی واقع تھا۔ کچھ دور جا کر وہ ایک بار پھر کماد کی فصل سے باہر نکلا اور سیمنٹ سے بنے پختہ نالے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ شرینہہ کے درخت کے پاس پہنچ کر وہ نالے کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ آج اس کی سطح اُس دن سے بھی زیادہ ٹھنڈی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ٹھنڈ سے کانپنے لگا تھا۔ نورل کی غیرحاضری پر اسے جی ہی جی میں غصہ آ رہا تھا۔ اس کا ذہن اب بھی اسے واپس جانے پر اکسا رہا تھا۔ وہ باربار اس خیال کو رد کر رہا تھا۔ اس کے دل میں کہیں یہ خواہش بھی چٹکی لے رہی تھی کہ وہ جا کر حویلی کے اس دروازے کو نزدیک سے دیکھ لے جہاں سے اس دن شمیم آئی اور گئی تھی۔

اس نے آس پاس نگاہ دوڑائی۔ کماد کی فصل میں یخ ہوا کے جھونکے سرسرا رہے تھے۔ ان کی سرسراہٹ پر اسے باربار کسی چڑیل کی ہنسی کا گمان گزرتا تھا۔ وہ گرد ن موڑموڑ کر اس جانب دیکھنے لگتا تھا۔ اس طرف پانی کے نالے کی لکیر دور تک چلی گئی تھی جبکہ دوسری طرف ایک کھیت خالی پڑا ہوا تھا۔ وہاں اگلے مہینے کپاس کا بیج ڈالا جانا تھا۔

وہ ٹھٹھرتا کانپتا ہوا نالے پر بیٹھا، شمیم سے اب تک ہونے والی ملاقاتوں کو یاد کرتا رہا۔ یاد کی شدت نے اسے اٹھنے پر مجبور کیا۔ وہ اٹھ کر خالی کھیت کی جانب بڑھا۔ کھیت میں چلتے ہوئے اس کے پاؤں کے نیچے سوکھی لکڑیاں چرچرانے لگیں۔

”وہ شاید آخری مکان میں رہتی ہو گی، نورل جسے باربار حویلی کہہ رہا تھا،“ اس نے سوچا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اردگرد دیکھنے لگا۔

اسے معاً کسی دروازے کی کنڈی اترنے کی آواز اور پھر اس کی چرچراہٹ سنائی دی۔ چند لمحوں کے بعد ایک دھیمی سی ہشکار اس کے کانوں میں پڑی۔ اس نے شمیم کے سائے کو دروازے سے باہر جھانکتے ہوئے دیکھا تو اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ اس کے ذہن سے تمام اندیشے اور وسوسے آناً فاناً مٹ گئے۔ ناہموار زمین پر دھیرے دھیرے چلتا ہوا وہ اس کے قریب پہنچ گیا۔ رات کے تیسرے پہر جب دنیا گھٹاٹوپ اندھیروں کے فسوں میں لپٹی، نیند کے خمار میں ڈوبی ہوئی تھی، دو پیار کرنے والوں کے سائے ایک دوسرے کے نزدیک آ کر، ٹھٹک کر رک گئے۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹوں کے جگنو دو لمحوں کے لیے جگمگائے اور انھیں لاحق تشویش کی دھند میں چھپ گئے۔

”میں بہت دیر سے تمھاری منتظر ہوں۔ تین بار دروازے سے باہر جھانک کر دیکھا مگر تم نظر نہیں آئے۔ میں پریشان اور مایوس ہو رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ تم نہیں آؤ گے۔ شاید تم مجھ سے روٹھ گئے... یا...“ وہ دھیمے لہجے میں بات کرتی کرتی رک گئی۔ اس کے لہجے کے اتارچڑھاؤ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنی موجودہ صورتِ حال سے گھبرائی ہوئی ہے اور اسے اپنی باتوں میں ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔

نذیر نے آہستگی سے کہنا شروع کیا: ”میں یہاں بہت پہلے پہنچ جاتا مگر میرا رازدار عین وقت پر آج مجھے دھوکا دے گیا۔ پھر تم جانتی ہی ہو کہ آدھی رات کو قصبے سے نکل کر اس طرف آنا کتنا بڑا جوکھم ہے۔ ہے کہ نہیں؟“ وہ اپنے استفسار کے بعد شمیم کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ جواب دینے سے پہلے دھیرے سے ہنسی۔ اس کی ہنسی کی مدھم سی کھنک نے سناٹے کا سینہ چاک کر دیا۔ ”جوکھم تو ہے، مگر تم سے زیادہ بڑا جوکھم تو میں نے مول لیا ہے۔ سنو!میرے سب گھروالے اس وقت گہری نیند سو رہے ہیں۔ تم چیزوں کو دیکھ بھال کر آہستہ آہستہ میرے پیچھے آؤ۔ دیکھو، کسی چیز سے ٹکرا کر گر مت جانا!“ اس کے لہجے سے جھلکتی شوخی یہ عندیہ دے رہی تھی کہ وہ اپنی تشویش اور گھبراہٹ پر قابو پاتی جا رہی ہے۔

وہ آگے بڑھی تو نذیر بولایا ہوا سا دروازے کو بھیڑتا ہوا اندر داخل ہوا۔

شمیم نے پلٹ کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا، ”سمجھ گئے نا؟ آؤ۔“

نذیر نے چند قدم آگے بڑھا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟“

یہ بات سن کر اس نے بمشکل اپنے آپ کو ہنسنے سے روکا۔ ”ڈرتے ہو تویہاں تک آئے کیوں تھے؟“ یہ کہہ کر وہ آگے چل پڑی جبکہ وہ ہولے ہولے اس کے پیچھے آنے لگا۔

دروازے سے کچھ دور جا کر ایک طویل برآمدہ شروع ہوتا تھا جہاں کئی ستون قطاروار کھڑے تھے۔ برآمدے میں ایک طرف تین کمرے واقع تھے جن کے دروازے بند تھے۔ برآمدے سے گزر کر وہ ایک کشادہ صحن میں آ گئے۔ صحن میں سو کینڈل پاور کے ایک بلب کی پھیکی سی روشنی پھیلی تھی۔ نذیر دبےپاؤں چلنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کے بےترتیبی سے پڑتے ہوئے قدم آواز کررہے تھے، جبکہ شمیم اس طرح بےآواز قدم اٹھا رہی تھی جیسے پانی کی سطح پر چل رہی ہو۔

کشادہ صحن میں چلتے چلتے داہنی طرف واقع ایک بڑے سے چھپر کے نیچے پہنچ کر وہ دونوں ٹھہر گئے۔

”میں نے تمھارے لیے بہت پہلے سے ہی چائے تیار کر لی تھی۔ تم یہاں کھاٹ پر بیٹھو۔ میں چائے لے آتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ کشادہ صحن کے کونے پر واقع باورچی خانے کی سمت چلی گئی۔

نذیر اسے بلب کی پھیکی روشنی میں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ اپنے دل و دماغ میں شدید بےقراری محسوس کر رہا تھا۔ اس وجہ سے اس کے لیے بیٹھ جانا ممکن نہیں ہو رہا تھا۔ وہ چھپر کے نیچے دھیرے دھیرے ٹہل کر گھر کا جائزہ لینے لگا۔ یہاں سے اس کی نگاہ پورے گھر کا احاطہ کر رہی تھی۔ اس نے باورچی خانے سے ملحقہ لکڑی کے اونچے سے دروازے کو دیکھا جو شاید گھر میں داخل ہونے کا مرکزی راستہ تھا۔

شمیم کو واپس آتا ہوا دیکھ کر وہ بیٹھ گیا۔ اس نے ایک ہاتھ میں کیتلی اور دوسرے میں دو پیالیاں اٹھا رکھی تھیں۔ چھپر کے نیچے پہنچ کر اس نے پیالیاں کھاٹ پر رکھ دیں اور کیتلی سے ان میں چائے انڈیلنے لگی۔

نذیر خوش دلی سے گویا ہوا، ”تم نے بہت اچھا کیا کہ اس وقت چائے بنا لی۔“

شمیم چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی، ”رات میں سردی بہت زیادہ ہوتی ہے اور پالا بھی گرتا ہے۔ اس لیے اس وقت چائے بہت ضروری تھی۔“

”میں پہلی بار تمھارے ہاتھ سے بنی چائے پیوں گا،“ نذیر نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ اس نے شمیم کی طرف دیکھا تو وہ اپنے سر پر ڈوپٹہ اوڑھے ہوئے بیٹھی تھی۔

”تم جانتے ہو، مہمان نوازی تو ہماری رگ رگ میں شامل ہے۔“

”بالکل ٹھیک کہتی ہو،“ وہ چائے کا گھونٹ لے کر کہنے لگا۔ ”درازہ شریف میں ہونے والی ملاقات کے بعد میں سمجھا کہ تم ڈر گئیں اور اب مجھ سے ملنا نہیں چاہتی۔ “

وہ ہنسی۔ ”میں تم سے نہیں ملنا چاہتی؟ اچھا! تو تم میرے بارے میں یہ سوچتے رہے؟ مجھے تاپ چڑھ گیا تھا۔ پورا ایک ہفتہ میں کھاٹ پر بیمار پڑی رہی۔ نوراں نے تمھارے پیغام مجھ تک پہنچائے تو تھے مگر میں نے ملنے سے منع کر دیا تھا۔“

”مگر میں تمھاری بیماری کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔“

”میں نے اسے کہا تو تھا کہ وہ اس بارے میں تمھیں بتا دے۔“ وہ باربار گردن گھما کر برآمدے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”اس روز تمھارے شوہر کو مجھ پر شک تو نہیں ہوا؟“

وہ کسمسا کر بولی، ”اسے شک نہیں ہوا۔ ویسے قبرستان بہت خوفناک جگہ ہے۔ قبروں کے درمیان پیار کی باتیں کرنا مجھے عجیب لگ رہا تھا۔ مگر تم مجھے اچھے لگتے ہو اس لیے تم سے ملنے میں وہاں چلی آئی۔“ وہ مسکرائی۔

”ملنے کے لیے جب کوئی اور جگہ نہیں مل سکی تو قبرستان کا انتخاب کرنا پڑا۔“ وہ پہلی بار ہنسا۔ ”تمھارے ہاتھوں کی چائے بہت مزےدار ہے۔“

اپنی تعریف سن کر وہ مسکرائی، پھر اسے اپنے شوہر اور اپنے سسرال والوں کے بارے میں بتانے لگی۔ اس کی یہ باتیں سنتے ہوے نذیر جماہیاں لینے لگا۔ وقفے وقفے سے گوٹھ کے آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ چھپر کے کسی کونے میں چھپا ہوا جھینگر مسلسل شور مچا رہا تھا۔

اس کی باتوں کے دوران نذیر نے اپنی جیب سے اس کے لیے بنوایا ہوا ہارنکالا اور اسے ہاتھ میں لہرا کر اسے دکھاتے ہوے کہنے لگا، ”میں نے سنارسے تمھارے لیے یہ ہار بنوایا ہے۔“

ہار کو دیکھ کرشمیم اپنی خوشی کو دبا نہ سکی۔ وہ بےساختہ ہنسنے لگی۔ ”میرے لیے؟“

”ہاں، تمھارے لیے۔ اگر تم اجازت دو تو میں یہ ہارتمھاری گردن میں پہنا دوں۔“

اسے جواب دینے کے بجاے وہ شرمانے لگی۔ نذیر اٹھ کر اس کے نزدیک آ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں ہار تھام لیا اور ذراسا جھک کر اپنے یخ بستہ ہاتھ اس کی نرم گردن تک لے گیا۔ اس کی انگلیاں اس کی مخملیں گردن کو چھونے لگیں۔

اس نے چہرہ جھکا لیا تھا۔ اس کی انگلیوں کو گردن پر محسوس کرتے ہوے اسے گدگدی سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو ہنسنے سے مشکل سے روکے ہوے تھی۔ اس کی بنجر اور بیزار زندگی کے لیے یہ لمحات مسرت و شادمانی سے بھرپور تھے، مگر ساتھ ہی اس کے دل کو گھر کے کسی فرد کے جاگ اٹھنے کا دھڑکا بھی لگا ہوا تھا۔ اسی لیے وہ اپنی خوشی کا دبا دبا اور گھٹا گھٹا سا اظہار کر رہی تھی۔

کم روشنی کی وجہ سے نذیر ہار کی زنجیر بند نہیں کر سکا۔ عاجز آ کراس نے ہار شمیم کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ ”یہ تم خود ہی پہن لینا۔ اور اب اپنے پیارے پیارے ہاتھ مجھے دکھاؤ۔“ وہ اس کے مقابل آ کر زمین پر بیٹھ گیا اور اس کے سمٹے ہوے نرم ہاتھوں کو اپنے کھردرے ہاتھوں میں لے کر انھیں دبانے لگا۔ پھر انھیں اپنے چہرے پر لے جا کر محسوس کرتا رہا۔ اس کے بعد وہ اس کی ہتھیلیوں کو اپنے ہونٹوں سے چومنے لگا۔

”ہار نیچے گر گیا،“ اس نے سرگوشی میں کہا۔

نذیر فوراً اس کے ہاتھوں کو چھوڑ کر، زمین پر جھک کر مٹی میں ہاتھ مارتے ہوے ہار ڈھونڈنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں وہ اسے مل گیا۔ اس نے اپنی قمیض سے ہار صاف کر کے اسے تھما دیا۔ ”تم پہن لو ابھی۔“

شمیم نے اس کا کہا مان لیا اور ہار پہن لیا۔ اس کے بعد اس نے کیتلی اٹھائی اوراس میں سے چائے انڈیل کر اسے پینے کے لیے دوسری پیالی پیش کی۔ چائے پیتے ہوے وہ مسلسل اس کی تعریف کرتا رہا۔ شمیم نے جب اس سے ہار کی قیمت دریافت کی تواس نے ہار کی جھوٹی قیمت بتائی۔ زیادہ قیمت کا سن کر وہ مرعوب ہوئی اور اسے اپنے زیورات کے متعلق بتانے لگی۔

اس کی بات کاٹتے ہوے نذیر نے کہا، ”آج میں صبح تک تمھارا مہمان ہوں۔“

”ہاں میرے پیارے۔“

اس مرتبہ نذیر اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا اور بیٹھتے ہی اس نے اپنا ہاتھ اس کی کمر کے گرد حمائل کر دیا۔ اگلے ہی لمحے کسی مزاحمت کے بغیرشمیم اس سے لپٹ گئی۔ نذیرکے پیاسے اور خشک ہونٹ شمیم کے نازک اور شیریں لبوں سے زندگی کا رس کشید کرنے لگے۔ وہ اس کے بوسوں کی شدت سے عاجز اور بےبس تھی۔ اس نے آنکھیں زور سے میچ لی تھیں اور خود کو اس کے پیار کی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی ندی کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا، جو اس کے لبوں سے ہوتا ہوا دھیرے دھیرے

اس کے پورے وجود کو بھگونے لگا تھا۔ نذیر کا جوش جتنا بڑھتا جا رہا تھا وہ اس کے بازوؤں میں اتنی ہی سمٹتی جا رہی تھی، پگھلتی جارہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں دونوں قباؤں سے بھی یکسر بےنیاز ہو گئے۔

پہلی بار کسی عورت کا جسم نذیر کے سامنے پوری طرح کھلا تھا۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش کے باوجود اس کی وحشت بےقابو ہوتی جا رہی تھی۔ پہلےپہل وہ ذرا ہچکچاتا رہا تھا۔ پھر اس کے لمس کی حرارت اور بوسوں کی شدت اس کی جانگھوں تک پھیلتی چلی گئی۔

شمیم آنکھیں میچے لمبے لمبے سانس بھر رہی تھی۔ اس کا ہر سانس، اس کی ہر سسکی، اس کی ہر لذت بھری آہ نذیر کی احسان مند تھی۔ اس کی رگوں میں عرصے سے جما ہوا لہو کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا تھا۔ اس کی نرم و گداز اندام نہانی گلاب کے پھول کی طرح کھلی ہوئی تھی اور عضوِ خاص کے لیے مچل رہی تھی۔

چھپر کی چھت سے اچانک ایک غراتی اور چیختی ہوئی بلی نذیر کی پشت پر آ گری۔ اسے محسوس ہوا کہ کوئی چڑیل آ کر اس کی پیٹھ سے چمٹ گئی ہے۔ نذیر کا منھ زوردار چیخ کے لیے کھلنے ہی والا تھا کہ شمیم نے اس پر ہاتھ رکھ دیا، مگر اس بیچارے کی روح فنا ہو چکی تھی۔ بلی کے پنجوں نے نذیر کی پشت کو زور سے رگیدا۔ اس کے بعد وہ اس کی پشت سے اتر کر چھپر کے کونے میں کہیں غائب ہو گئی۔

بلی کے پنجوں کی رگڑ، اس کے جسم کے وزن اور اس کی لجلجاہٹ نے اسے لذت بھرے طلسمی دریا سے نکال کر باہر اچھال دیا۔ وہ چند لمحے نسوانی جسم پر بےسدھ لیٹا رہا۔ اس بدن کے بوجھ سے شمیم کی سانسیں گھٹنے لگیں۔ وہ ا س کے نیچے تڑپ رہی تھی اور آہیں بھر رہی تھی۔ دفعتاً نذیر نے اپنا سر اٹھایا اور صحن سے ملحقہ برآمدے کی طرف دیکھا اور گھر کی دیگر اشیا پر بھی نگاہ ڈالی۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ نیند اور سکوت میں ڈوبا ہوا گھر اور اس کی تمام چیزیں یک بہ یک بیدار ہو گئی ہیں اور اس بلی کی طرح غراتی ہوئی اس کی جانب لپک رہی ہیں۔ خوف اور دہشت کے سبب اس کے جسم کے ایک ایک عضو میں تشنج کی لہر سی دوڑ گئی۔

شمیم کا ہاتھ اٹھا اور اس کے سر کے بالوں سے اٹکھیلیاں کرنے لگا۔ وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوے دھیرے سے گویا ہوئی، ’’کیا ہوا؟ تم ایک بلی سے ڈرگئے؟‘‘

نذیر نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔ ’’اس نے تو میری جان ہی نکال دی،‘‘ اس نے تیز اور طویل سانس کھینچتے ہوے کہا۔ ’’مجھے لگا کہ وہ کوئی بلی نہیں، بلکہ کوئی غیر مخلوق ہے۔‘‘ اس کی یہ بات سن کر شمیم افسوس سے سر ہلانے لگی۔

اسے سر ہلاتے دیکھ کر نذیر کو اپنی شکست کا احساس ہونے لگا۔ وہ اپنی خفت مٹانے کے لیے اس پر دوبارہ دراز ہو گیا اور اس کے کانوں کی لوؤں کے آس پاس کے نرم و گداز علاقے پر اپنے بوسوں کی بارش کرنے لگا۔ مگر اس مرتبہ اس کے بوسوں میں نہ پہلے والی حدت رہی تھی اور نہ ہی وہ شدت۔ پہلے بوسوں کے دوران اس کے انگ انگ پر عجیب سی مستی چھا گئی تھی۔ وہ ایک طائرِ آزاد کے مانند فضاے جسم کے تمام گوشے دریافت کرتا رہا تھا اور نت نئی دریافتوں کے لیے کوشاں تھا، لیکن اب اس کے ہر بوسے سے بیزاری کا احساس نمایاں ہو رہا تھا۔ اس کے لیے وہ کارِ لذت سے زیادہ عذابِ جاں بن کر رہ گیا تھا۔ وہ اس کی گردن کی مہین و نازک جلد کو اپنے لبوں سے چومتا اور نوکِ زبان سے چاٹتا رہا مگر اس کے اندر کی تحریک مردہ ہو چکی تھی اور اس کے لہو میں سنسناتے، کلبلاتے، تڑپتے، تلملاتے سارے جذبے سرد پڑ چکے تھے۔ اچانک وہ شمیم کے اوپر سے ہٹا اور اس کے برابر میں لیٹ گیا۔

شمیم کروٹ لیتی ہوئی اٹھی اور کھاٹ سے اتر کر جلدی جلدی کپڑے پہننے لگی۔ نذیر نے کھاٹ پر لیٹے لیٹے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنی طرف کھینچا، مگر اس نے ایک ہی جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اس کی گرفت مضبوط نہیں تھی۔ اس نے دھیمے لہجے میں آواز دے کر اسے بلانا چاہا، مگر وہ اس کے قریب نہیں آئی۔ وہ ذرا پرے ہو کر آہیں بھرتی اپنے لباس کی شکنیں درست کرتی رہی۔ پھر وہ آنگن میں رکھی گھڑونچی کی طرف گئی، اس نے مٹکے کو لٹا کر کٹورے میں پانی انڈیلا اور اس کے بعد زمین پر بیٹھ کر گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگی۔

نذیر شدید اذیت میں تھا۔ وہ کچھ دیر تک بےتکے انداز میں چارپائی پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھا رہا، پھر نیچے اتر کر کپڑے اٹھائے کونے میں چلا گیا۔ شمیم پیتل کے کٹورے میں اس کے لیے پانی لے آئی۔ وہ اس کے ہاتھ سے پانی کا کٹورا لے کر کئی دنوں کے پیاسے شخص کی طرح یک ہی گھونٹ میں سارا پانی پی گیا۔

”میری ساس تھوڑی دیر میں اٹھنے والی ہے، اگراس نے دیکھ لیا تو یہ ہم دونوں کے لیے اچھا نہیں ہو گا،“ وہ دھیمے لہجے میں بولی اور اس کے ہاتھ سے کٹورا لے کر دور ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

وہ اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا، اسے اپنی حالتِ زار کے بارے میں بتانا چاہتا تھا، لیکن اس کی بات سننے کے بعد اس میں کچھ بھی کہنے کا حوصلہ نہ رہا۔ وہ ہونق نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ اسے احساس ہو چکا تھا کہ اب اس کی تمام گرمجوشی پر اوس پڑ چکی ہے۔ نذیر اٹھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور دھیرے دھیرے صحن کی طرف بڑھنے لگا۔

صحن سے برآمدے میں آتے ہوے وہ ایک ستون سے ٹکرایا۔ وہ خود کو سنبھالنا چاہتا تھا مگر اس کے اعصاب پر ایک حواس باختگی طاری ہو چکی تھی۔ کھیتوں کی طرف کھلنے والے دروازے سے نکلتے ہوے اس کا پیر چوکھٹ سے بھی ٹکرا یا۔ اس مرتبہ وہ لڑکھڑایا اور باہر کی طرف منھ کے بل گرتے گرتے بچا۔ وہ سنبھل تو گیا مگر اس کے پاؤں کی ڈگمگاہٹ ختم نہیں ہو سکی۔ وہ گھر سے باہر نکلا تو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا، نہ راستہ، نہ مکان، نہ کھیت۔ وہ ڈگمگاتا اور لڑکھڑاتا ناہموار زمین پر چلتا رہا۔ وہ پلٹ کر دیکھنا چاہتا تھا مگر دیکھ نہیں سکا۔ وہ جانتا تھا کہ پیچھے دو آنکھیں اسے رخصت کرنے کے لیے موجود ہیں۔ اپنی ندامت اور خفت کے سبب اس کے لیے ان آنکھوں کی طرف دیکھنا ممکن نہ تھا۔ وہ جلدازجلد یہاں سے دور جانا چاہتا تھا تاکہ ان آنکھوں کی پہنچ سے نکل جائے۔

شمیم گھر کے دروازے سے لگ کر نڈھال کھڑی آہیں بھرتی رہی اور اسے جاتے ہوے تکتی رہی۔ کچھ دیر بعد اس نے دروازہ بند کر دیا اور اس کی کنڈی چڑھا دی۔

نذیر کا وجود درد کا گولہ بنا ہوا تھا۔ اس کی ٹانگیں دکھ رہی تھیں۔ بازوؤں میں اتنا شدید درد تھا کہ اسے لگتا تھا کہ وہ کٹ کر اس کے کاندھے سے جھول رہے ہیں۔ زمستاں کی رات میں گرتے کہرے اور پالے میں اسے اپنا خون اور اپنی سانسیں منجمد محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ اوبڑکھابڑ زمین پر دقت کے ساتھ قدم اٹھاتا رہا۔

وہ شرینہہ کے دیوقد پیڑ کے پاس پانی کے نالے پر بیٹھ گیا۔ آنے کے بعد وہ اسی جگہ بیٹھ کر شمیم کا انتظار کرتا رہا تھا۔ نالے کی سیمنٹ کی سطح اسے پہلے سے بہت زیادہ یخ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بیٹھ کر اپنے ہاتھوں کو مسلنے لگا تاکہ وہ گرم ہو سکیں، مگر بہت دیر تک ہاتھ مسلتے رہنے کے باوجود ان میں حرارت پیدا نہ ہو سکی۔ اس کی ٹانگیں بھی وقفے وقفے سے کانپ رہی تھیں۔

وہ اچانک اُٹھا اور ایک پگڈنڈی پر دوڑ کر رگوں میں جامد خون کو گرم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ دور جا کر رات کے پالے سے بھیگی ہوئی پگڈنڈی پر اس کا پاؤں پھسلا اور وہ کماد کی فصل میں جا گرا۔ اس کے کپڑے اور پاؤں گیلی مٹی میں آلودہ ہو گئے۔ گرنے سے اس کا بدن اور زیادہ دکھنے لگا۔ کماد کے کھیت میں دشواری سے چلتے ہوے وہ دھیرے دھیرے گوٹھ ہاشم جوگی سے دور ہوتا چلا گیا۔

بہت آگے جا کر وہ جھاڑیوں سے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا نہر کے پُل پر پہنچ گیا اور اندھیرے کے سبب سیاہ نظر آتے پانی کو دیکھنے لگا۔ نہر کا پانی اپنے کناروں سے نیچے نیچے بہہ رہا تھا۔ اس کی سطح پر ٹمٹماتے ستاروں کا عکس جھلملا رہا تھا۔

ہولے ہولے اس کا خوف زائل ہو رہا تھا۔ درختوں کا عکس پانی میں دھندلے دھبوں کی طرح نظر آ رہا تھا۔

اس نے قصبے کے مکانوں کی جانب نگاہ کی تو وہ سب اسے ایک ڈھیر کی صورت ایک دوسرے کے اوپر تلے پڑے ہوے دکھائی دیے۔ وہ مکانات کے اس ڈھیر میں چھپی ہوئی گلیوں سے اس طرف آیا تھا۔ پل پر کھڑے کھڑے اس نے اپنی چشمِ تصور سے شمیم کو بستر پر درازدیکھا اور اس کی تلخ آہوں کو سنا۔ اس نے بےبسی اور لاچاری سے دانت کچکچائے۔ اپنی دونوں مٹھیاں بھینچ لیں۔ اس کے وجود میں ایک ساتھ اذیت کی کئی لہروں نے سر اٹھایا۔ اس کے دل نے چاہا کہ وہ اونچی آواز میں چیخے چلائے اور سینہ کوبی کرتے ہوے اپنی چھاتی کو زخمی کر ڈالے۔ اسے اپنے وجود کے وہ سب حصے جن سے اس نے شمیم کو چھوا تھا، قابلِ نفریں محسوس ہوے۔ اس نے اپنی انگلیوں کی طرف دیکھا اور اپنے ہاتھ سے اپنے ہونٹوں کو ٹٹولا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہاں سے خون رسنے لگے۔ اس نے نہر کنارے کسی درخت پر رسی باندھ کر خودکشی کے بارے میں سوچا۔

وہ بڑبڑایا: ”آج کے دن کی شروعات منحوس طریقے سے ہوئی تھی۔“

اس کے بدن میں اب بھی درد تھا اور اس کے اعضا کی دکھن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ وہ پل سے اتر کر نہر کے کنارے پیڑوں کی قطار کے نیچے چلنے لگا۔ کچھ دور جا کر وہ ایک ایسی جگہ پر کنارے سے نیچے اترنے لگا جہاں پر نہر کا پانی اسے زیادہ گہرا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بے سوچے سمجھے نہر کنارے کی ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پربیٹھ گیا۔ کچھ آگے کھسک کر اس نے اپنی چپلوں سمیت اپنے پاؤں نہر میں ڈال دیے۔ نہر کا پانی اسے بہت ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی یخ لہریں اس کے ٹخنوں اور پنڈلیوں میں گھسنے لگیں۔ مگر نذیر کے سر میں عجیب سودا سمایا ہوا تھا۔

وہ نہر کے پانی میں لرزتا ہوا اپنا دھندلا دھندلا عکس دیکھتا رہا۔ وہ اپنی رگوں میں اپنے جامد خون کو گرمانا چاہتا تھا۔ شمیم سے ملاقات کے دوران اسے جس ہزیمت اور اذیت کا بوجھ اٹھانا پڑا تھا، وہ اس کا کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا۔

اپنے عضوِلذیذ کو بہت دیر تک رگڑنے اور مسلنے کے بعد اس کے جسم میں حرارت پیدا ہونے لگی۔ اسے اور زیادہ حرارت کی ضرورت تھی۔ اس کے ہاتھوں کی حرکت دھیرے دھیرے مجنونانہ اور وحشیانہ انداز اختیار کرتی چلی گئی۔ اگر اس وقت اسے کوئی شخص اس حال میں دیکھ لیتا تو یقیناً فاترالعقل یا سودائی خیال کرتا۔

اس کے رگ و ریشے میں یکلخت کئی الاؤ جلنے لگے۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں نمایاں ہونے لگیں۔ اس کی سانسیں کسی دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں۔ وہ اپنے ہاتھوں کی حرکت میں مزید تیزی پیدا کرتا گھاس پر لیٹ گیا اور سیاہ آسمان کو تکنے لگا۔

ایک شدید ہیجان خیز لمحے میں وہ سرعت سے اٹھ کھڑا ہوا اور نہر کے پانی میں انزال کی بوندیں گرانے لگا۔ اگلے ہی وہ گھاس پر نڈھال ہوکر گر پڑا اور زور زور سے سسکیاں لینے لگا۔ اس کو معلوم نہیں تھا کہ صبحِ صادق اب صرف چند لمحوں کی منتظر تھی۔

صبح دیر سے جاگنے کے باوجود نذیر کے جسم میں کل شب کی ہزیمت اور اذیت کے آثار باقی تھے۔ اس نے کمرے میں جا کر صندوق سے استری شدہ لباس نکالا۔ وہ جلدازجلد غسل کرنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ چاچی اس کے کپڑوں پر مٹی اور گھاس کے نشان دیکھ لے اور کسی شک میں مبتلا ہو جائے، مگر وہ جیسے ہی برآمدے میں آیا، چاچی خیرالنسا اسے برآمدے میں ٹہلتی دکھائی دی۔ وہ اسے دیکھ کر تولیے سے اپنے بال سکھانے لگی۔

چاچی اس کے پاس آ گئی اور اسے ٹوہ لینے والی نظروں سے دیکھنے لگی۔

اس نے سنجیدگی سے کہا، ”تیرا چاچا آج سویرے سویرے ہی دکان پر چلا گیا۔ “

نذیر نے اسے دیکھا مگر کوشش کے باوجود اس سے آنکھیں نہیں ملا سکا۔ وہ کتھئی رنگ کے ریشمی لباس میں تھی جو اِس کی سفید رنگت سے مل کر پرکشش تاثر پیدا کر رہا تھا۔ اس کی گردن اور کلائی کا رنگ نکھرا نکھرا لگ رہا تھا۔ اس کے سر سے ڈوپٹہ اُترا تو اس کی خوبصورتی دوچند ہو گئی۔

”آج تو دیر تک گہری نیند سوتا رہا۔ دکان جانے سے پہلے تیرے چاچے نے تجھے ایک دو بار جگانے کی کوشش کی، مگر تو ہلاجلا ہی نہیں، “اس نے بےتکلفی سے کہا۔

وہ اس کے ہونٹوں پرپہلی بار لگی ہوئی لپ اسٹک کی تہہ دیکھ کر بولا، ”رات جب تو کمرے میں چلی گئی تو اس کے بعد میں سو نہیں سکا۔ “ پہلی بار اسے چاچی کے بھرپور خدوخال روکھے پھیکے سے محسوس ہو رہے تھے۔

”مجھے بھی نیند مشکل سے آئی۔“ وہ چاہتی تھی، نذیر آج بھی اس کی تعریفیں کرے اور اس سے اپنی چاہت کا اظہار کرے۔ مگر وہ اس سے کھنچا کھنچا سا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پژمردگی تھی اور لہجے میں گرمجوشی کے بجاے سوگواری تھی۔ وہ اسے نظرانداز کرتا، نیلے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں پرندے اُڑتے پھر رہے تھے۔ ”تیرے لیے ناشتہ تیار ہے،“ وہ ٹھنڈا سانس بھرتے ہوے بولی۔

”غسل کر کے کھا لوں گا،“ یہ کہتے ہوے وہ کپڑے اٹھائے غسل خانے کی طرف چل دیا۔

ناشتے کے بعد اس نے ایک اور چائے پینے کی فرمائش کر دی۔ وہ باورچی خانے جا کر اس کے لیے ایک اور چائے کی پیالی لے آئی۔ وہ اس سے گریزاں سا تھا۔ اس کا جسم اور چہرہ دیکھ کر اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ اسے بالکل یاد نہیں تھا کہ اس

نے کل رات اس سے کیا کیا باتیں کی تھیں۔ اس کے اعصاب اور حواس پر شمیم سے ملنے کے دوران ہونے والی شکست سوار تھی۔ وہ اپنی ناکامی کے عذاب میں مبتلا تھا۔

”آج تو نے پیٹ بھر کے ناشتہ نہیں کیا۔“

”بھوک ہی کم تھی۔“

وہ سوچ رہی تھی کہ آج اچانک اسے کیا ہو گیا۔ وہ پہلے تو اکیلا ہی چار پانچ روٹیاں کھا جاتا تھا۔ ”آج تجھے دکان پر جانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے تیری طبیعت خراب لگ رہی ہے۔ تو آرام کر لے،“ اس نے اپنائیت سے کہا۔

”دکان پر تو نہیں مگر ذرا دیر کو باہرگھومنے جاؤں گا۔“

اس کی بات سن کر وہ افسردہ ہو گئی۔

نذیر نے اچانک اس کے بارے میں سوچا کہ کیا وہ اس عورت سے وصل کر کے اپنی جذباتی شکست کا مداوا کر سکتا تھا۔ اسے اچانک باورچی خانے میں پیش آنے والے واقعے کی جزئیات یاد آئیں تو وہ حیران رہ گیا۔ اس نے کس طرح اسے چومتے ہوئے اپنے بازوؤں میں بھر لیا تھا؟

ان خیالات کا سلسلہ بھی اس کے مزاج کی سردمہری کو ختم نہیں کر سکا۔ وہ پیالی سے چائے کی آخری چسکی لے کر باہر جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔

”سن! تیرا چاچا ہاروالی بات بھول گیا ہے۔“

وہ روکھی مسکراہٹ سے بولا، ”اچھا؟“اس کے بعد ٹھنڈا سانس لیتے ہوے وہ گلی کی طرف چل پڑا۔

گلی سے گزرتے ہوے تنہائی میں وہ سوچتا رہا کہ کل رات کے تیسرے پہر جو کچھ پیش آیا وہ محض ایک اتفاق تھا۔ اگر بلی چھپر کی چھت سے اس کی پیٹھ پر چھلانگ نہ لگاتی تو اس کا شادکام ہونا یقینی تھا۔ وہ اپنے آپ کو تسلی دینے لگا کہ اسے احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ بالکل ٹھیک تھا۔ اس کی مردانگی پوری طرح بحال تھی اور نہر کنارے بیٹھ کر اپنے انزال کے آب دار موتی نہر کے پانی میں گرا چکا تھا۔ یہ سب باتیں سوچنے کے باوجود وہ خود پر اپنے یقین اور اعتماد کو بحال نہیں کر سکا۔

اس نے پان کی مانڈلی سے کچھ سگریٹ خریدے اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا کھیتوں کی طرف چل دیا۔ وہ سگریٹ سلگا کر اس کے لمبے کش لیتا آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔

مکمل تنہائی میں مکمل خودسپردگی کے لیے آمادہ عورت سے مباشرت میں ناکامی غیرمعمولی اور شرمناک بات تھی۔ شمیم خود کو ملامت کرتی رہی ہو گی اور اسے ایک نامرد تصور کر کے دل ہی دل میں اس کا مضحکہ اڑاتی رہی ہو گی۔ نذیر نے فیصلہ کیا کہ وہ اب ہمیشہ کے لیے اس سے قطع تعلق کر لے گا اور آئندہ کبھی نورل کی شکل بھی نہیں دیکھے گا۔ اپنے آپ سے یہ عہد کرتے ہوے وہ جانتا تھا کہ اس کی خاطر اس کا دل بری طرح مچلے گا اور کیا پتا وہ نیند میں اُٹھ کر نہر کی طرف دوڑتا چلا جائے۔

وہ قصبے کی مشرقی سمت میں واقع آخری مکانوں تک پہنچا اور انھیں عبور کرتا ہوا کھیتوں میں داخل ہو گیا۔ تاحدِنظر زمین پر سبزیوں اور گندم کے پودے لہلہا رہے تھے۔ سورج آسمان کے وسط میں چمک رہا تھا اور سارے میں پیلی سی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ گردوپیش اچٹتی سی نگاہ ڈال کر وہ سر جھکائے ایک پگڈنڈی پر چلنے لگا۔

وہ اپنے آپ کو باربار سمجھاتا رہا کہ اس کے ساتھ جو واقعہ پیش آ چکا تھا وہ اس کے اناڑی پن کی وجہ سے پیش آیا تھا۔ اس نے پہلی اور بنیادی غلطی پکوڑافروش کے ہمراہ مے خانے جا کر کی تھی۔ وہاں اس نے چرس اور بھنگ کا بےمحابا استعمال کیا تھا، جس کی وجہ سے اس کے حواسِ خمسہ کند ہو گئے تھے۔ پھر شدید سردی کے موسم میں آدھی رات کو چوری چھپے گھر سے نکلنا، ویران اور تاریک گلیوں میں خوفزدہ چلنا، آہٹوں پر چونکنا اور کھیتوں کے پاس کانپتے ہوے انتظار کرنا — یہ تمام چیزیں بھی تو اس افسوسناک عمل کی رونمائی میں شامل تھیں۔

سوچتے سوچتے اس کا دماغ شل ہو گیا اوروہ تھک کر ایک بلندقامت شیشم کے پیڑ کے نیچے پگڈنڈی پر ہی بیٹھ گیا۔

چاچی خیرالنسا کے بارے میں سوچتے ہوے اس نے عجیب شرمندگی محسوس کی لیکن اسے معلوم تھا کہ یہی وہ عورت ہے جو اس کے اعتماد کو بحال کر سکتی ہے۔

وہ بیٹھے بیٹھے تین سگریٹ پھونکنے کے بعد اپنی الجھنوں کو سلجھائے بغیر اُٹھا اور قصبے کی طرف واپس چل دیا۔

اگلے دن وہ سویرے اٹھا اور چابیاں لے کر دکان چلا گیا۔

جانے سے پہلے باورچی خانے میں ناشتہ کرتے ہوے اس نے محسوس کیا کہ چاچی اسے ملامت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں کی تاب نہ لا کراس کے ہاتھ سے چائے سے بھرا پیالہ نیچے گر گیا اور گرم چائے نے اس کے پاؤں کو جلا دیا۔ اپنی تکلیف کو چھپاتے ہوے وہ اس سے آنکھیں ملائے بغیر اٹھا اور باورچی خانے کی کوٹھڑی سے باہر نکل گیا۔

دکان پر پہنچ کر اس نے اپنی جیب سے چابیاں نکالیں اور شٹر پر لگے ہوے تالے کھولے۔ شٹر اٹھا کر دکان کھول کر وہ صفائی کرنے کے بجاے دیواروں پر چسپاں فلمی اداکاراؤں کی تصویروں کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ کچھ نئی تصویروں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ تصویروں کے نزدیک ہو کر انھیں ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک بھاری سی مردانہ آوازنے اسے چونکا دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو یعقوب کاریگر اس کے قریب ہی کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ نذیر کو ڈرانے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

”دیوار پر لگے نئے نئے فوٹو کیسے ہیں؟ میرے ایک دوست نے مجھے باہرکے ملک کا ایک رنگین رسالہ تحفے میں دیا تھا۔ میں نے اس میں سے بہترین تصویریں نکال کر یہاں لگا دیں۔ ذرا دیکھو! اس فوٹو کا تو جواب نہیں۔“

”ویسے تمھاری پسند کا بھی کوئی جواب نہیں۔“

کاریگر اپنی تعریف سن کر اس تصویر کی خصوصیات پر روشنی ڈالنے لگا۔ ”اسے غور سے دیکھو! اس کے بالوں کا رنگ بالکل سونے جیسا ہے۔ اس کے چہرے پر دلکش مسکراہٹ دیکھ کر ہم جیسا خوامخواہ خوش ہونے لگتا ہے۔ ذرا اس کی چمڑی کو دیدے پھاڑ کر دیکھو، کتنی چمکیلی اور نرم ہے۔ اور اس کے ممّے تو...“ وہ بےقابو ہو رہا تھا۔

وہ آگے بڑھ کر چمکیلے رنگین کاغذ کی سطح پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ پھر تصویر کو چومتے ہوے کہنے لگا، ”پتا نہیں کہاں اور کون سے دیس میں رہتی ہیں یہ پریاں۔ ہماری قسمت میں تو باگڑی اور بھیل بھکارنیں لکھی ہیں۔“ وہ بیڑی سلگا تے ہوے اپنی سلائی مشین کے پاس لگی نشست پر بیٹھ گیا۔

نذیر نے اسے چھیڑا۔ ”تمھارے پاس کپڑے سلوانے خوبصورت عورتیں بھی آتی ہیں۔ پھر ان سے دوستی کیوں نہیں کرتے؟“

”وہ بہت چالاک اور ہوشیار ہوتی ہیں۔ آسانی سے ہاتھ بھی نہیں آتیں۔ پھر انھیں قابو کرنے کے لیے پیسوں کی بہت ضرورت پڑتی ہے۔ میں ٹھہرا ایک غریب درزی۔ تمھارے چاچے کی قسمت بہت اچھی ہے کہ اسے زندگی بھر کے لیے ایک حسین اور جوان عورت مل گئی۔“

نذیر نے اس سے یونہی ایک بات پوچھی۔ ”اب اس کی پریشانی کا کیا حال ہے؟“

یعقوب کاریگر یہ سننے کے بعد اپنی آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ اپنی بیڑی کی راکھ جھٹکتے ہوے اُٹھا اور گلی میں جھانکنے کے بعد نذیر کے پاس آ بیٹھا۔ وہ رازداری سے کہنے لگا، ”میں جانتا ہوں تم شریف آدمی ہو، اسی لیے میں تمھیں پسند کرتا ہوں مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ تمھاری وجہ سے پریشان ہے۔ اس نے کل یہ بات مجھ سے رازداری رکھنے کی قسم لینے کے بعد بتائی۔“

”میری وجہ سے؟“

”اسے شک ہے کہ تم اس کی بیوی کے ساتھ خراب ہو۔“ اس نے بیڑی کو فرش پر پھینکا اوراسے پاؤں کے نیچے مسلتے ہوے کہنے لگا، ”وہ تھوڑی دیر میں آنے والا ہو گا۔ دکان بند ہونے کے بعد تم مجھ سے جوگی کے چائے خانے پر ملو۔“

واقعی تھوڑی دیر بعد چاچا غفور دکان پہنچ گیا۔ یعقوب کاریگر سلائی میں مصروف تھا جبکہ نذیر قمیص کے بٹن لگاتا رہا۔ اس دوران غفور نے ایک بار بھی نذیر سے کوئی بات تک نہ کی۔ وہ سر جھکائے اپنے کام میں لگا رہا۔

شام ڈھلنے سے کچھ پہلے ہی نذیر چائے خانے پر جا بیٹھا۔ وہ گردوپیش کی چیزوں کو دیکھنے کے بجائے باربار فکرمندی سے کاریگر کی بتائی ہوئی باتوں کے متعلق سوچتا رہا۔

غفور چاچا کی پریشانی کا راز جاننے کے بعد وہ شدید احساسِ گناہ میں مبتلا تھا۔ وہ خود کو ملامت کرتا رہا کہ اس نے جانے یا انجانے میں چاچی کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ حیران تھا کہ چاچے کو اس معاملے کی خبر آخر کیسے مل گئی۔ اب وہ فرار چاہتا تھا تاکہ اس کی وجہ سے یہ محترم رشتہ کہیں پامال نہ ہو جائے۔ مگر اس کے دل کی گہرائی میں کوئی شدید جذبہ موجود تھا جس کے آگے وہ خود کو پوری طرح بےبس محسوس کر رہا تھا۔ اس کے لیے اب وسوسوں اور اذیت کے مہیب جنگل میں چاچی خیرالنسا ہی واحد پناہ گاہ رہ گئی تھی۔

وہ ان ہی سوچوں میں گم تھا کہ اس نے یعقوب کاریگر کو آتے ہوئے دیکھا۔ وہ آتے ہی چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گیا اور جلدی جلدی بیڑی پھونکتا رہا۔ اس کی پیشانی پر دو گہری لکیریں تھیں۔

اس نے چٹکی بجا کر راکھ کو جھٹکا اور استغراق سے نکل کر نذیر کو گہری نظر سے دیکھتے ہوئے کھنکار کر اپنا گلا صاف کرنے لگا۔ پھراس نے اس کی طرف تھوڑا جھک کر دھیمے لہجے میں کہا، ”غفور سے میری دوستی بہت پرانی ہے۔ تمھاری عمر سے بھی زیادہ پرانی۔ اس نے بڑی بدفعلیاں کیں۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ تین ضلعوں میں کوئی چکلا نہیں بچا ہو گا جہاں جا کر اس نے زنا نہ کیا ہو۔ اس کے بیسیوں معاشقے اس کے علاوہ ہیں۔ اسی وجہ سے جب اس نے شادی کی تو کچھ عرصے کے بعد اسے پہلی مرتبہ اپنی کمزوری کا احساس ہوا۔ وہ مجھ سے چھپ چھپ کر اپنا علاج کرواتا رہا۔ مگر اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکا۔ ایک دن پریشان ہوتے ہوئے اس نے شرمندگی سے مجھے بتا ہی دیا۔ میں اسے رانی پور میں ایک واقف حکیم کے پاس لے گیا۔ اس کی دوا سے غفور کی قوت بحال ہونے لگی اور وہ شادی کے مزے سے ہمکنار ہوا۔“ کہتے کہتے وہ خاموش ہوا اور اِدھراُدھر دیکھنے لگا۔

نذیر اس کے ہونٹوں سے نکلنے والا ایک ایک لفظ بغور سن رہا تھا۔

کاریگر نے چائے کا گھونٹ بھرا اور سرگوشی میں پھر سے کہنے لگا، ”کل پہلی بار اس نے مجھ سے تمھارے قتل کے بارے میں بات کی۔ دکان کے کام میں تمھاری عدم دلچسپی کی وجہ سے اسے شک ہونا شروع ہوا۔ وہ اندر ہی اندر کڑھنے لگا۔ کئی مرتبہ اس نے تمھاری جاسوسی کی۔ دیوار پھاند کر اپنے گھر میں گھسا۔ رحیم سنار والے مسئلے پر اس نے تم پر ہاتھ اٹھانے کے بارے میں مجھے بتایا تو میں نے اس پر لعن طعن کی کہ اسے تم پر شک نہیں کرنا چاہیے۔“ اس نے چائے کی پیالی ختم کی اور نئی بیڑی سلگائی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر گویا ہوا۔ ”اس کی باتوں نے مجھے پریشان کر دیا۔ میں رات بھر سوچتا رہا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ تم سے ضرور بات کروں گا۔ شاید غفور اپنی بیوی کو وہ آسودگی نہیں دے سکا جو اس کا حق تھا۔ اسے ہر وقت کھٹکا لگا رہتا ہے کہ وہ اسے چھوڑ کر کسی اور سے اپنا تعلق جوڑ لے گی۔ یہ معاملہ تمھارے حق میں خطرناک ہو سکتا ہے۔ تم اس کے گھر میں رہتے ہو اور تمھاری اس کی بیوی کے ساتھ بےتکلفی بھی ہے۔“ وہ جواب طلب نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

نذیر ٹھنڈا سانس بھر کر بولا، ”تمھارا اندازہ ٹھیک ہے۔“

”میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ تم اپنی عزت اور زندگی بچاؤ اور میرپور ماتھیلو واپس چلے جاؤ۔ تمھیں یہاں سے جانے کے لیے وہ کبھی نہیں کہے گا لیکن اگرکسی دن اس کا مغز گھوم گیا تو پتا نہیں کیا کر بیٹھے۔“ اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

”تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو؟“

کاریگر ہنسا۔ ”مت بھولو میں اس کا پرانا دوست ہوں۔ وہ اپنی دو محبوباؤں کے شوہروں کو زخمی کر چکا ہے۔ یہاں غیرت کا مسئلہ بھی ہے اور کل بےساختگی میں اس کے منھ سے نکل گیا کہ اسے ثبوت ملنے کی صورت میں اس نے تمھیں قتل کرنے کا منصوبہ بھی تیار کر رکھا ہے۔ وہ تمھیں کارا کر کے مار ڈالے گا، کیا سمجھے؟“

نذیر یہ سن کر ہکابکا رہ گیا۔ ناقابلِ یقین بات کی حقیقت کو اسے اپنے دل سے تسلیم کرنا پڑا۔

شام ڈھلے کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔ آسمان پرستارے نکل آئے تھے۔ چائے پینے والے سب گاہک بھی جا چکے تھے۔ ہوٹل کا مالک برتن سمیٹ رہا تھا۔ وہ اٹھے اور نہر کے پل تک ساتھ چلتے ہوے گئے۔ وہاں سے نیچے اترنے والے راستے پر وہ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔

کچھ دور تک اس کے ذہن میں کاریگر کی باتیں گھومتی رہیں۔ یہ سب تو اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا مگر اب اسے اندازہ ہونے لگا تھا کہ یہاں رہتے ہوے اس کے ساتھ کوئی بھی واقعہ پیش آ سکتا ہے۔ اسے غفور چاچا پیشہ ور قاتل معلوم ہوا۔ اس کی سماعت میں اس کی پاٹ دار آواز گونجنے لگی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں اسے یاد آئیں جن میں ہر وقت اسے اپنے لیے عناد بھرا محسوس ہوتا تھا۔ اسے گزشتہ روز کی مارپیٹ یاد آئی۔ وہ کتنے نفرت انگیز لہجے میں اسے مخاطب کرتا ہوا چیخ رہا تھا۔

نذیر نے خود کو اپنے گھر والوں سے دور، اجنبی لوگوں کے درمیان مکمل طور پر غیرمحفوظ محسوس کیا۔

وہ نیم تاریک سڑک پر روشنی کے کمزور دائروں میں چلتا رہا۔ اس نے سوچا کہ کیا خبر اس کا چاچا یعقوب کاریگر کے ساتھ مل کر اسے قصبے سے بھگانا چاہتا ہو تاکہ اس کے تمام خدشات ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں۔

وہ گھر جانے کے بجاے پہلوان دستی کے چائے خانے پر جا بیٹھا۔

اسے کاریگر پر اعتماد تو تھا مگر وہ فرار ہونے کے خیال سے ہچکچا رہا تھا۔ چاچی خیرالنسا کے بارے میں سوچتے ہوے اس کے دل میں باربار ہوک سی اٹھ رہی تھی۔ اسے اس کا طویل قامت جسم یاد آیا، اس کے فسوں کار انگ یاد آئے۔ اس نے چاچی کو دیکھنے، اس کے پاس بیٹھنے اور اس سے لپٹنے کی ناقابلِ مزاحمت خواہش محسوس کی۔

وہ چائے خانے پر بیٹھا رہا اور ٹھری میرواہ میں اپنے گزرے ہوے وقت کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے دل میں گناہ کا احساس دھیرے دھیرے ختم ہو رہا تھا۔ کل اسے سوچتے ہوے جو ندامت محسوس ہو رہی تھی اب وہ مٹتی جا رہی تھی۔ اب وہ عورت واقعی اس کی محبوبہ بن گئی تھی۔ وہ خود سے کہتا رہا کہ پہلی بار اسے محبت ہوئی ہے اور اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس کے متعلق جو چاہے سوچتا رہے۔ اس نے چاچے کو رقیب جان کر اس کے خلاف اپنے دل میں شدید نفرت محسوس کی۔ نفرت سے ا س کے اعصاب تن گئے اور وہ مٹھیاں بھینچ کے رہ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اپنی محبت کی خودغرضی کے باوجود وہ اسے ہمیشہ کے لیے حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے کر فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ بہت دیر تک وہ ذہنی کشمکش سے دوچار رہا۔

ڈبو کھیلنے والے لڑکے شور مچا رہے تھے۔ پہلوان دستی اپنے دکھل کے پاس اونگھ رہا تھا۔ رات کے دس بجنے والے تھے۔ قصبے سے باہر جانے والی گاڑیاں شام سے پہلے ہی بند ہو جاتی تھیں۔

وہ چائے خانے سے اٹھا اور جھجکتے ہوے قدموں سے اس مکان کی طرف چل دیا جو اب اس کا گھر نہیں رہا تھا۔ گلی میں پہنچ کر وہ کچھ دیر کے لیے ٹھیر گیا۔ سارے مکان تاریکی میں ڈوبے ہوے تھے۔ ایک خیال کی دہشت سے جھرجھری لیتے ہوے اس نے پاؤں آگے بڑھایا۔

دروازے کی کنڈی کھول کر وہ اندر آیا تو اس نے باورچی خانے والی کوٹھڑی کو بند پایا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا برآمدے میں بچھی اپنی چارپائی تک پہنچا اور بیٹھ گیا۔ اسے بھوک نہیں تھی۔ وہ اپنا سر ہاتھوں میں لیے بیٹھا رہا۔

کچھ دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سن کر وہ چونکا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو چاچی خیرالنسا دروازے سے باہر نکلتی دکھائی دی۔ وہ اسے دیکھ کر عجیب انداز میں مسکرائی۔ اس نے فوراً آگے بڑھ کر برآمدے کی بتّی جلا دی۔

نذیر پریشانی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”چاچا جاگ جائے گا۔“

”آج وہ صبح سے پہلے نہیں جاگے گا۔“ وہ ایک بار پھر مسکرائی۔

”کیوں ؟“ نذیرنے حیرت سے پوچھا۔

”نیند کی ایک گولی اس نے خود کھائی اور دو میں نے دودھ میں گھول کر اسے پلا دیں۔“

”آخر ایسا کیوں کیا؟“

چاچی خیرالنسا نے لجاتے ہوئے کہا، ”تم سے ملنے کے لیے۔“

نذیر نے خود کو اس عورت کے زیرِاثر محسوس کیا۔ وہ دونوں باورچی خانے کی کوٹھڑی میں جا بیٹھے۔

”میرے لیے کھانا مت گرم کرنا۔ میں نے باہر کھا لیا ہے۔“

وہ چولھے کے پاس بیٹھی تھی جبکہ نذیر اس کے قریب پیڑے پر۔ اس نے لمبا سانس لیتے ہوئے خود کو پُراعتماد پایا۔ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

”مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں،“ وہ بولا۔

”کہو۔“

”تؤ میرے چاچے کی بیوی ہے مگر میں تجھ سے محبت کرتا ہوں،“ اس نے بےجھجک اپنے دل میں سمائی بات کہہ دی۔

”میں جانتی ہوں یہ گناہ اور بےحیائی ہے، مگر تو بھی جان لے کہ تو مجھے اچھا لگتا ہے۔ اسی لیے آج رات میں نے بڈھے کو نیند کی گولیاں کھلا دیں۔ میں جانتی ہوں تو اس کا احترام کرتا ہے۔“ وہ بہت آہستہ بول رہی تھی۔ ”میں بھی تیری طرح ڈرتی ہوں اس سے۔ لیکن توخود سوچ!اس کے اور میرے درمیان کتنا فرق ہے۔“

اسے اداس دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا۔ ”آدھی عمر کا فرق ہے! اور میں جب سے یہاں آیا ہوں، یہی سوچ رہا ہوں۔ تو اس سے بہت چھوٹی ہے اور خوبصورت بھی بہت ہے۔“ وہ مسکرانے لگا۔ ”پرسوں رات میرے اور تیرے بیچ جو کچھ ہوا میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں سمجھا کہ تو مجھ سے بہت ناراض ہو گی اور مجھے تجھ کو منانا پڑے گا۔“

یہ سن کر چاچی خیرالنسا اپنی مسکراہٹ کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتی رہی مگر مسکراہٹ خودبخود اس کے ہونٹوں پر نمایاں ہو گئی تھی۔

نذیر نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ یعقوب کاریگر سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں اسے کچھ نہیں بتائے گا۔ اس نے تشویش سے اس سے ایک سوال پوچھا، ”صبح چاچے کو گولیوں کے بارے میں پتا نہیں چل جائے گا؟“

”نہیں چلے گا۔ وہ یہی سمجھتا رہے گا کہ جو گولی اس نے کھائی یہ اسی کا نشہ ہے۔“ وہ پھر مسکرانے لگی۔

”میں پہلے تیرے بارے میں جب بھی سوچتا تھا تو خود کو بڑا گناہگار سمجھتا تھا،“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”اور اب؟“ چاچی نے شرارت سے پوچھا۔

”اب تیری محبت کو میں اپنا حق سمجھتا ہوں۔“

”میں تو اندر سے کانپ رہی ہوں۔ وہ گہری نیند کر رہا ہے، میں پھر بھی یہاں سہمی ہوئی ہوں، اور یہ گناہ ہے، بڑا گناہ!“ اس نے جھرجھری لی اور آنکھیں میچ لیں۔

”یہ گناہ نہیں ہے، محبت کبھی گناہ نہیں ہوتی،“ وہ بلند لہجے میں بولا۔

”آخر تم رشتے میں میرے بھتیجے لگتے ہو۔“

”ٹو اپنی مرضی سے میری چاچی نہیں بنی اور میں...“ وہ جذبے کی شدت سے خاموش ہو گیا۔

”کچھ بھی ہو، میں اس بوجھ سے نہیں بچ سکتی... مگر خود کو روکنا بھی مشکل ہے،“ وہ آہ بھر کر بولی۔

نذیر اس کے سوگوار چہرے کو دیکھتا رہا۔ وہ حیران تھا کہ اسے کیا ہو گیا۔ وہ اسے خوش دیکھنا چاہتا تھا مگر اس کے پاس تمام الفاظ ختم ہو گئے تھے۔ اسے خوشی سے ہمکنار کرنے کے لیے اور اپنی باقی ماندہ زندگی کے لیے ایک خوشگوار یاد کو اپنے سینے میں محفوظ رکھنے کے لیے وہ اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے اس کے بدن کا لمس کشید کرنے لگا۔ وہ ایک نئی لذت سے آشنا ہوتا جا رہا تھا۔

انھوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا اور ہنسنے لگے۔ کچھ دیر بعد وہ برآمدے میں بچھی ہوئی چارپائی پر جا کر ایک دوسرے کے پہلو میں لیٹ گئے اور ان کے ترسے ہوے جسم نہ جانے کب تک ایک دوسرے میں مدغم ہانپتے کانپتے رہے۔

بہت دیر کے بعد چاچی خیرالنسا اپنے کپڑے اٹھا کر غسل خانے کی طرف چلی گئی مگر وہ وہیں چارپائی پر لیٹا رہا۔

غسل خانے سے باہر نکل کر چاچی نے نذیر کے ہونٹوں پر آخری بوسہ دیا اور اسے نگاہ بھر دیکھنے کے بعد کمرے میں اپنے سوئے ہوے شوہر کے پاس چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد نذیر آہ بھرتے ہوے مسکرایا۔ اس نے چاچی خیرالنسا کو پا کر کھو دیا تھا، ہمیشہ کے لیے۔ مگر اپنے لیے ایک یاد کو محفوظ کر لیا تھا۔

وہ بہت دیر تک جاگتا رہا۔ پھر اس نے دیکھا کہ صبح کی روشنی پھیلنے والی ہے۔ اس نے اٹھ کر کپڑے پہنے۔ غسل خانے میں گیا لیکن غسل نہیں کیا۔ ہینڈپمپ چلا کر وہ اپنے ہاتھ اور منھ دھو کر باہر نکل آیا۔ وہ صحن میں چند لمحے ٹہل کر کچھ اور وقت گزرنے کا انتظار کرتا رہا۔ اس نے کمرے کے دروازے سے کان لگا کر ان دونوں کی سانسوں کی آو از سنی اور دھیرے دھیرے چلتا باہر کی طرف چل پڑا۔

وہ جانتا تھا کہ اس وقت قصبے سے باہر جانے کے لیے سواری نہیں ملے گی۔ اس نے چلتے ہوے گلی عبور کی، سڑک پر پہنچا۔ پہلوان دستی کے چائے خانے کے قریب سے گزرا۔

آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا وہ قصبے کی حدود سے باہر نکل گیا۔